رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

جلد ۵۸ ، عدد ۴

جولائی ۱۹۶۲ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵- اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے

قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

اسلامی ریاست

سید ابوالاعلیٰ مودودی

- اسلام کے نظریۂ سیاسی کی مستند تشریح
- اسلام کے نظامِ ریاست کی مکمل تصویر
- اسلامی دستور اور قانون پر سیر حاصل بحث
- پاکستان میں تدوینِ دستور کی تاریخ کا ایک اہم باب
- علماء و طلباءِ قانون و سیاست کے لیے ایک خزینۂ علم
- علمِ سیاست پر ایک عظیم کتاب
- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے تبحرِ علمی کی آئینہ دار

عمدہ کتابت مضبوط جلد ۔ قیمت اعلیٰ بارہ روپے ۔ سستا ایڈیشن آٹھ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۴	جولائی ۶۲ء	جلد ۵۸

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن

اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

رائے اور تعبیر میں اختلاف بالکل فطری چیز ہے اور انسان جب تک غور و فکر کرنے کے بنیادی حق سے دستبردار نہیں ہوجاتا یہ اختلاف دنیا کے اندر بہرحال موجود رہے گا۔ اس کے ختم ہونے کی صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اس بات کی توفیق دے کہ وہ خود لوحِ محفوظ کو دیکھ کر منشاء ربانی معلوم کر سکے یا پھر پوری نوعِ بشری حیوانوں کا ایک ایسا گلہ بن جائے جو قوتِ فکر و شعور سے یکسر عاری ہو اور اُسے ایک قوتِ قاہرہ جس طرح چاہے میکانکی طور پر ہانک کرلے جائے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رشد و ہدایت کے لیے جو انتظام فرمایا ہے اس میں ان دونوں ممکنات کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ اُس حکیم ذات نے اپنی حکمتِ بالغہ سے کام لیتے ہوئے ہر شخص کو اس امر کی توفیق نہیں دی کہ وہ اُس کے احکام براہِ راست اُس سے حاصل کر سکے۔ خداوند تعالیٰ نے اپنے مقصد و منشا کو انسانیت پر واضح کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام کو ہی ذریعہ بنایا ہے۔ وہ ان نفوسِ قدسیہ کی وساطت سے نوعِ بشری کو اپنی تعلیمات سے آگاہ کرتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کے یہ برگزیدہ بندے انسانوں میں رہ کر، انسانی بندھنوں میں بندھ کر اُس کے احکام سے لوگوں کو آشنا کریں اور پھر خود ان احکام پر عمل کر کے ان کے عملی مضمرات اُن کے ذہن نشین کرائیں۔

ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے وحیِ الٰہی نازل فرما کر اور انبیاء علیہم السلام کو بھیج کر انسانیت

کو گمراہی سے بچانے کا انتظام فرمایا مگر دوسری طرف اُس نے انسانوں کو ضمیر، شعور، وجدان جیسی کسوٹیاں بھی عطا کیں تاکہ وہ ان کے ذریعہ کھوٹے اور کھرے کے درمیان تمیز کر سکیں۔ انسانی زندگی میں یہ کسوٹیاں بہت بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ اب جبکہ سلسلۂ نبوت کے آخری تاجدار خداوند تعالیٰ کے منشا و مقصد کو ہم پر پوری طرح واضح کر کے ہم سے رخصت ہو چکے ہیں اور یہ منشارِ ربانی ہمارے پاس قرآن و سنت کی شکل میں پوری طرح محفوظ ہے تو اب ہماری ہدایت کا راز صرف اسی بات میں مضمر ہے کہ ہم ان پر مسلسل غور و فکر کر کے ان کے مطابق عمل کرتے رہیں۔ لیکن اس غور و فکر کے معاملے میں بھی یہ احتیاط انتہائی ضروری ہے کہ اس کا محرک ہماری ذاتی خواہش یا ہوائے نفس نہ ہو بلکہ اس تحقیق کے پیچھے صرف یہی مقدس ارادہ کارفرما ہو کہ منشارِ شریعت کو اس کی پوری جزئیات و تفصیلات کے ساتھ معلوم کر سکیں۔

جن معاملات میں اللہ تعالیٰ کے احکام بالکل واضح ہیں اور اُن میں کسی معقول تعبیر کی کوئی گنجائش نہیں اُن میں امت کے کسی طبقہ میں بھی کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح حضور سرورِ کائنات صلعم نے شریعت کے جن گوشوں کی پوری طرح نقاب کشائی کر دی ہے ان کے اندر بھی ملت کے ہر طبقہ میں اتفاق و اتحاد ہے اور دنیا کے سارے مسلمان ان امور میں ایک دوسرے سے پوری طرح متفق ہیں۔ توحید، رسالت، آخرت یہ وہ معتقدات ہیں جن پر دنیا کے سارے مسلمان ایمان رکھتے ہیں اور ان کے معاملے میں ان کے اندر پوری پوری وحدتِ فکر پائی جاتی ہے۔ جہاں تک نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی فرضیت کا تعلق ہے اس معاملہ میں بھی امت کے اندر کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ اس کے علاوہ صداقت، امانت، راستبازی، صاف گوئی یہ وہ بنیادی انسانی صفات ہیں جن کے بارے میں امت کے اندر کبھی دو رائیں نہیں ہوئیں۔ امت کے ہر طبقہ نے انہیں ایک مسلمان کے لیے نہایت اہم اور بنیادی صفات قرار دیا ہے۔

ایمان و عمل کے ان گوشوں سے ہٹ کر دین اور شریعت کے بعض گوشے ایسے بھی ہیں جن میں حسنِ نیت اور اخلاص کے باوجود اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ ان شعبوں میں اگر کوئی صاحبِ ایمان کسی لالچ یا نفسانیت کے تحت نہیں بلکہ اخلاص کے ساتھ کوئی اختلاف رکھتا ہے اور اس اختلاف کے لیے اُس کے پاس ایسے ٹھوس وجوہ ہیں جن کی تائید دین ہی سے ہوتی ہے تو اُس شخص کو بد باطن نہیں کہا جا سکتا۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے دین کا اُسی طرح تابع ہے جس طرح کہ دوسرے مسلمان۔

اختلاف کی وہ قسم البتہ امت کے لیے مہلک ہے جس کا محرّک ہوائے نفس ہو اور جس کی تہ میں اخلاص کی بجائے نفس پرستی کام کر رہی ہو۔ وہ شخص جس کی نیت صرف یہی ہو کہ وہ منشاءِ الٰہی کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اپنی زندگی کو اُس کے مطابق ڈھالے، وہ اگر دین کے کسی جزو میں تعبیر کی کوشش کرتا ہے تو اُس کی نوعیت اُس تعبیر سے یکسر مختلف ہو گی جو بندگیٔ نفس کے تحت کی جاتی ہے۔ پہلی تعبیر میں انسان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملے میں خدا اور اُس کے رسول کے فیصلے کو ٹھیک ٹھیک معلوم کرے اور اگر کسی شعبے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ قطعی اور دوٹوک نہ ہو اور اُس میں ایک سے زیادہ آرا ممکن ہوں تو اس میں بھی اس کے غور و فکر کا منتہائے مقصود یہی ہوتا ہے کہ وہ اسی رائے کو اختیار کرے۔ جو دین کے پورے مزاج سے سب سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ ترک و اختیار کے اس دائرہ میں بھی وہ ذاتی خواہش کو قطعاً دخیل نہیں ہونے دیتا بلکہ ہر قدم پر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ احکام الٰہی اور حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی کوئی ایسی تعبیر کرے جو مقتضیاتِ دین کے عین مطابق ہے۔

یہ ممکن ہے کہ اس مقدس عزم، نیک ارادے اور خلوص نیت کے ساتھ جب کسی معاملہ کی تعبیر کی جائے تو اُس میں اختلاف کے کئی پہلو نکل آئیں۔ اس قسم کا اختلاف نہ تو امت کے لیے

پہلے کبھی نقصان دہ ثابت ہُوا ہے اور نہ اب ہو سکتا ہے۔ اس اختلاف کا مطلب یہ ہے کہ ہر غور کرنے والا دل کی گہرائیوں سے اس بات کا متمنی ہے کہ وہ کسی ایسے معاملے میں جس میں قرآن و سنت دونوں خاموش ہیں اس کی کوئی ایسی توجیہ کرے جو دین کے مزاج سے بالکل مطابقت رکھتی ہو۔ اگر آپ اس اختلاف کے محرکات کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس کے پیچھے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی اور حضور سرور کائنات کی محبت اور اُن کی تابعداری کے مقدس جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ اختلاف کسی جہت سے بھی امّت کے لیے باعثِ تکلیف نہیں۔ اس حقیقت کو ہم ذیل کی ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں وضو کے متعلق جو آیت نازل ہوئی ہے اُس میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ۔ (۵:۲)	اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو چاہیے کہ اپنے مُنہ، اور ہاتھ کہنیوں تک دھو لو، سروں پر ہاتھ پھیر لو اور پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔

پھر اس حکم کی عملی تفسیر جو ہمیں حدیث میں ملتی ہے اُس میں وضو کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے:

عن حمران مولى عثمان بن عفان انه رأى عثمان دعا بوضوء فافرغ على يديه من انائه فغسلهما ثلث مرّات ثم ادخل يمينه في الوضوء ثم تمضمض واستنشق واستنثر ثم غسل وجهه ثلثا ويديه الى المرفقين	حمرانؓ (حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام) نے عثمان بن عفان کو دیکھا کہ انہوں نے وضو کا پانی مانگا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھوں پر برتن سے پانی ڈالا اور انہیں تین مرتبہ دھویا، پھر اپنا داہنا ہاتھ پانی میں ڈال دیا اور کُلّی کی اور ناک میں پانی لیکر ناک صاف کی۔ پھر اپنے منہ کو تین مرتبہ اور ہاتھوں

ثلثاً ثم مسح براسه ثم غسل کل رجل ثلثا ثم قال رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتوضأ نحو وضوءی ھذا۔	کی کہنیوں تک تین بار دھویا، پھر سر کا مسح کیا، پھر پاؤں کو تین مرتبہ دھویا اور پھر کہا میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اسی وضوء کی مثل وضوء کرتے ہوئے دیکھا ہے۔
(بخاری - کتاب الوضوء)	

قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیت، حضور سرور کائنات کی یہ اور اسی قسم کی بعض دوسری احادیث وہ بنیادیں ہیں جن کی روشنی میں ہم وضوء کی عملی تفصیلات معلوم کر سکتے ہیں۔ اور ان تفصیلات میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے لیکن اس اختلاف کی نوعیت دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر صاحبِ نظر کے سامنے مقصد ایک ہی ہے کہ وہ کسی طرح حضورؐ کے قول و عمل کی پوری پوری متابعت کرے۔

جب ہم وضوء کے احکام کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے سب سے پہلے یہ حقیقت آتی ہے کہ نماز کے لیے وضو ضروری شرط ہے الآیہ کہ اس میں کوئی ایسی چیز مانع ہو جس کی خود اللہ تعالیٰ اور حضورؐ نے تصریح فرما دی ہے۔ کتاب الٰہی اور سنتِ نبوی کی اس بارے میں چونکہ صراحت موجود ہے اس لیے اس کے وجوب میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں۔ اس پر ائمہ امت کا اجماع ہے۔

اب اختلاف جو کچھ ہے وہ انہیں تفصیلات کے بارے میں ہے جن میں فی الواقع اس کی پوری گنجائش موجود ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلا اختلاف یہ ہے کہ کیا نیت صحت وضوء کے لیے شرط ہے۔ ائمہ اکرام کے ایک گروہ کا استدلال یہ ہے کہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انما الاعمال بالنیات فرمایا ہے اس لیے وضو کی نیت ضروری ہے۔ اس مقدس گروہ میں امام شافعی، امام مالک، امام احمد و ابی ثور اور داؤد (رحمہم اللہ) ان سب پر اپنی رحمت کی بارش نازل فرمائے، شامل ہیں۔ دوسری طرف امام ابو حنیفہ اور سفیان ثوری (رحمہم اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو نور سے

بھر دے) ہیں۔ یہ حضرات نیت کو صحتِ وضوء کے لیے شرط نہیں سمجھتے۔ اب آپ دیکھیے کہ ان کے اختلاف کی وجہ کتنی فطری ہے۔ عبادت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک عبادتِ محض جس کا مقصد صرف قربتِ الٰہی ہے جیسے نماز۔ عبادت کی دوسری قسم کو فقہاء نے عبادۃ معقول المعنی کہا ہے جیسے نجاست کا دھونا پہلی قسم کے لیے تمام ائمہ کے نزدیک نیت شرط ہے اور دوسری قسم کی عبادت کے لیے نیت کو شرط نہیں قرار دیا گیا۔ اب وضوء ایک ایسی عبادت ہے جس میں دونوں امکانات موجود ہیں۔ ایک اعتبار سے یہ عبادتِ محض ہے اور دوسرے نقطۂ نظر سے یہ عبادۃ معقول المعنی ہے۔ امام شافعیؒ اور اُن کے رفقا کا ارشاد یہ ہے کہ چونکہ یہ عبادتِ محض بھی ہے اس لیے اس کے لیے نیت شرط ہے۔ دوسری طرف امام ابوحنیفہؒ اور اُن کے پایۂ ساتھی اسے دوسری قسم کی عبادت خیال کرتے ہیں اس لیے اُن کے نزدیک نیت وضوء کے لیے شرط نہیں۔

اس کے بعد دوسرا اختلاف دیکھیے۔ بعض ائمۂ دین یہ کہتے ہیں کہ وضوء کے برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ انہیں دھو لیا جائے۔ اُن کے اس استدلال کی بنیاد حضور سرورِ کائناتؐ کے ارشادات ہیں۔ مثلاً حضور سرورِ دو عالم نے فرمایا:

اذا استیقظ احدکم من نومہٖ	تم میں سے جو کوئی بھی نیند سے بیدار ہو تو وہ ہاتھوں
فلا یغمس یدہٗ حتی یغسلھا ثلاثاً	کو تین مرتبہ دھوئے بغیر برتن میں نہ ڈالے کیونکہ وہ
فانہٗ لا یدری این باتت یدہٗ۔	نہیں جانتا کہ وہ حالتِ خواب میں کہاں رہے ہیں۔

ترمذی اور ابن ماجہ میں یہی الفاظ تھوڑے سے تغیّر و تبدّل کے ساتھ یوں وارد ہوئے ہیں۔

اذا استیقظ احدکم من اللیل	جب رات کی نیند سے کوئی بیدار ہو۔

دارقطنی میں ان الفاظ پر معمولی سا اضافہ ہے:

؎ بدایۃ المجتہد ص۸ جزو اول

اذا استیقظ احدکم من منامہٖ فلا یدخل یدہ فی الاناء حتیٰ یغسلھا ثلاث مراتٍ فانہ لا یدری این باتت یدہ او این طافت یدہٗ ۔	جب تم میں سے کوئی نیند سے بیدار ہو تو وہ ہاتھوں کو برتن میں ڈالنے سے پہلے تین مرتبہ دھولے کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اُس کے ہاتھوں نے رات کہاں گزاری ہے یہاں وہ کس جگہ گھومتے رہتے ہیں

روایات میں کہیں کہیں فلیغسلھا ثلاثاً کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ اس لیے بعض فقہاء نے اس سے وجوب کا استدلال کیا ہے کہ جب کوئی شخص نیند سے بیدار ہو تو برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے انہیں لازمی طور پر تین مرتبہ دھو لینا چاہیے۔ یہ معنی اُن حضرات نے کیے ہیں جنہوں نے اس حدیث اور آیتِ وضو کے درمیان کسی قسم کا تعارض نہیں سمجھا۔ چنانچہ امام شافعیؒ نے ہر قسم کی نیند سے بیدار ہونے پر اس فعل کو ضروری قرار دیا ہے۔

اس کے بعد اختلاف کی دوسری صورت یہ پیش آتی ہے کہ کیا یہ حکم صرف رات کی نیند کے ساتھ مختص ہے یا اس کا اطلاق ہر قسم کی نیند پر ہوتا ہے۔ امام احمدؒ اور امام ابوداؤدؒ نے حدیث کے لفظ "باتت" کی بنیاد پر یہ استدلال کیا ہے اس سے مراد صرف خوابِ شب ہی ہے کیونکہ رات کے وقت ہی انسان پر نیند کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اعضاء کی حرکت کے بارے میں کچھ شعور نہیں رکھتا مگر دن کے وقت بے شعوری کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ ان حضرات کے برعکس دوسرے آئمہ نے یہ کہا ہے کہ یہ ایک عام حکم ہے اور اسے رات کی نیند کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی شعوری قوتیں صرف خوابِ شب ہی میں معطل نہیں ہوتیں بلکہ اُس پر جب بھی نیند غالب آتی ہے تو شعور کے در خود بخود بند ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ لاشعور کے کواڑ کھل جاتے ہیں جن حضرات نے مندرجہ بالا حدیث کی یہ مختلف تعبیرات کی ہیں وہ سارے حق پر ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی بد باطن یا گمراہ نہیں کہا جا سکتا۔

اسی طرح کلائی دھونے کے معاملے کو لیجیے۔ اس میں اختلاف کی اصل بنا "اِلیٰ" اور "ید" کے الفاظ ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ۔ جمہور علما، امام مالک، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ تعالیٰ ہاتھ کو کہنیوں تک دھونے کے قائل ہیں۔ اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ لفظ اِلیٰ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ہاتھ کو بشمول کہنی دھونا چاہیے کیونکہ جس چیز کی غایت بیان کی جا رہی ہو وہ اُس میں شامل ہوتی ہے۔ دوسری طرف امام زُفر رحمہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس آیت اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی اللَّیْلِ سے استدلال کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ چونکہ رات وہ انتہا ہے جس کے آغاز تک روزہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا حکم ہے اور اس میں لفظ اِلیٰ رات کو شامل نہیں کرتا، اس لیے ہاتھ کے دھونے میں کہنی کا دھونا شامل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ہاتھ کا لفظ بھی کلامِ عرب میں مختلف موقعوں پر مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں اس سے مراد صرف ہتھیلی ہے، کہیں اس کے مفہوم میں ہتھیلی اور کلائی دونوں شامل ہوتی ہیں اور کہیں اس لفظ کا اطلاق بازو پر بھی ہو جاتا ہے[۲]۔ اختلاف کی یہ گنجائش حقیقی طور پر موجود ہے اور اس معاملے میں جن ائمہ سلف نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا ہے وہ درحقیقت تعبیر کا اختلاف ہے، نیت کا فساد نہیں۔

تعبیر و توجیہ کے یہ اختلافات جن کے چند نمونے اوپر درج کیے گئے ہیں فقہی ادب کی سلوٹوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر مہیا نہیں کیے گئے۔ یہ وہ چند ابتدائی باتیں ہیں جن سے ہر وہ شخص آشنا ہے جس نے کبھی بھی اپنے بیش قیمت فقہی سرمائے پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ فقہی مسائل میں فقہاء کرام نے جو یہ مختلف آرا پیش کی ہیں ان کا محاکمہ نہ میرا مقصد ہے اور نہ میں کسی اعتبار سے اس کا اہل ہوں۔ مجھے اپنی حدود کا پورا پورا احساس ہے۔ ان مختلف تعبیرات کو میں نے صرف اس لیے آپ کے سامنے نقل کیا ہے تاکہ آپ دین کے اندر

---

[۱] ہدایہ صفحہ ۱ [۲] بدایۃ المجتہد

تعبیر و توجیہ کے صحیح مزاج کا اندازہ کر سکیں۔

اس تعبیر میں پہلی چیز جو فوراً انسان کے ذہن میں آتی ہے وہ ان مقدس حضرات کا اخلاص اور دین کے ساتھ سچی اور گہری محبت ہے۔ ان کی اس توجیہ کا مقصد نفس پرستی نہیں بلکہ للٰہیت ہے الفاظ کی چھان پھٹک، احادیث کی ترتیب و تشریح اور قرآن مجید کی مختلف آیات کی توضیح میں ان پاکباز لوگوں کے سامنے ہمیشہ ایک ہی مقصد رہا کہ وہ کسی طرح اس منشا کو صحیح صحیح سمجھ سکیں جو ان احکام کے معاملے میں خدا اور اس کے رسول کے پیش نظر ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ ان کی تحقیق کا مرکز و محور قرآن و سنت ہی ہے اور ان کی ساری کوششیں قطب نما سوئی کی طرح صرف اسی ایک محور کے گرد گھومتی ہیں۔ مقدس انسانوں کے اس پورے گروہ میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جس نے اپنے ذاتی رجحانات اور دلپسند افکار کو دین کے اندر داخل کرنے کی کوشش کی ہو۔ دنیا کی پوری تاریخ میں مسلمان فقہا اپنی بے لوثی کی وجہ سے منفرد اور ممتاز ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ فقہی احکام کے استنباط میں ان حضرات نے غایت درجہ کی غیر جانبداری کا ثبوت دیا اور اس امر کی پوری پوری کوشش کی کہ اُن کے ذاتی احساسات یا مروجہ افکار کی کوئی معمولی سے معمولی پرچھائیں بھی اُن کے اس کام پر پڑنے نہ پائے۔ یہ ایک بڑا ہی نازک مرحلہ ہے کہ آدمی قرآن و سنت کے سرچشموں سے فقہی احکام کی جوئے رواں جاری کرنے کی سعی کرے لیکن وہ سب سے پہلے اپنی ذاتی خواہشات کو الگ کر کے رکھ دے اور کسی مقام پر انہیں اثر انداز ہونے کا موقع نہ دے۔ یہ عظیم الشان کام وہی لوگ ہی سرانجام دے سکتے ہیں جنہوں نے اپنے نفس کو خودغرضی اور تعصب کی ہر آلائش سے پاک کر رکھا ہو۔ اور اپنے احساسات کی اس طریق سے تربیت کی ہو کہ ان کے اندر کسی مرحلہ میں بھی احکامِ الٰہی اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متصادم ہونے کی جسارت نہ پیدا ہونے پائے۔ چنانچہ دیکھیے کہ مسائلِ وضو میں ہم نے جتنے اختلافات درج کیے ہیں وہ وہی ہیں جن میں فی الواقع تعبیر اور توجیہ کی پورے اخلاص کے ساتھ گنجائش ہو سکتی ہے۔ کسی فقیہ نے بھی ان

احکام میں اپنی من مانی تاویلات پیش کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ سب سے دین کے مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے کسی حکم کی وہی تعبیر کی ہے جو پورے دین سے اس کے نزدیک زیادہ سے زیادہ مناسبت رکھتی ہو۔

تعبیر کی اس مخلصانہ نوعیت کے برعکس ایک نفس پرستانہ نوعیت بھی ملاحظہ کیجیے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِىْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ	اور انسانوں ہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو گانا بجانا خریدتا ہے تاکہ بھٹکا دے لوگوں کو راستے سے علم کے بغیر، اور ان آیات کا مذاق اڑائے۔ ایسے لوگوں کے لیے رُسوا کن عذاب ہے۔ ان کے سامنے جب تلاوت کی جاتی ہے تو یہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ اس طرح رُخ پھیر لیتے ہیں گویا کہ انہوں نے سنا ہی نہیں گویا کہ وہ بہرہ گوش ہیں۔ ایسے لوگوں کو دردناک عذاب کا مژدہ سنادو۔

اس آیت میں "لہوالحدیث" ایک ایسی ترکیب ہے جس کی بعض بد باطن لوگوں نے عجیب و غریب تاویل کی ہے۔ لغت کے اعتبار سے اس کے معانی ہیں غفلت میں ڈالنے والی بات عربی زبان کی بہترین لغت قاموس میں اَلھیٰ کے معنی ہیں اِشْتَغَلَ بِالْغِنَاءِ یعنی گانے میں یا گانا سننے میں مشغول ہوا۔ چنانچہ لہوالحدیث سے مراد گانا اور باجے کے ہیں۔ شرع نے ان کا یہی نام رکھا ہے۔ یہی تفسیر اس کی حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت مجاہدؒ، حضرت عکرمہؒ حضرت مکحول، حضرت ابواسحاق وغیرہ نے کی ہے۔ اسی کی تائید دین کا پورا مزاج کرتا ہے مسند احمد مسند حمیدی، جامع ترمذی میں حضرت ابوامامہ سے ایک ایک روایت منقول ہے:

لَا تبیعوا المغنیات ولا تشتروهن	گانے والیوں کی خرید و فروخت، گانا سکھانا اور

ولا تعلموهن ولا خیر فی تجارۃ فیھن وثمنھن حرام۔ فی مثل ھذا انزلت ھذہ الآیۃ۔	اُن کی قیمت سب حرام ہے اور یہ آیت اسی ضمن میں نازل ہوئی ہے۔

اسی طرح حضرت ابو الصھبا فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پوچھا کہ اس آیت کے کیا معنی ہیں تو آپ نے فرمایا:

وَاللہِ الذی لا الٰہ غیرہٗ ھو الغناء۔	قسم ہے اُس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ اس سے مراد گانا بجانا ہی ہے۔

مشہور مفسر امام قرطبی نے فرمایا ہے:

ان اولیٰ ما قیل فی ھذا الباب ھو تفسیر لھو الحدیث بالغناء قال وھو قول الصحابۃ والتابعین۔	لھو الحدیث کی تفسیر کے تحت جتنے اقوال بھی بتائے جاتے ہیں ان میں سب سے زیادہ راجح قول یہ ہے جس میں لھو الحدیث سے غنا مراد لیا گیا ہے۔ اور یہی قول صحابہ اور تابعین سے بھی منقول ہے۔
(تفسیر فتح القدیر ج ۴ صفحہ ۲۳۶)	

قرآن مجید کا اندازِ بیان، حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تشریحات، ائمہ لغت کی توضیحات اور دین کا پورا مزاج اس بات پر گواہ ہے کہ یہاں لھو الحدیث سے مراد گانا بجانا یا وہ داستانیں ہیں جو انسان کو آیاتِ الٰہی سے غافل کر دیں لیکن گزشتہ چند برسوں میں بعض مفسدین نے صرف حدیث کے ایک لفظ کو لیکر یہ فتنہ پھیلانے کی مذموم کوشش کی ہے کہ یہاں حدیث سے مراد معاذ اللہ احادیثِ نبوی ہیں جو انسان کو کتابِ الٰہی سے غافل کرنے کا سبب بنتی ہیں۔ اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ آخر تمہاری اس توجیہ کی کوئی معقول اساس تو ہونی چاہیے تو وہ بڑی جسارت کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی تعبیر صرف "ملا" کی اجارہ داری نہیں بلکہ اس کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔

قرآن مجید کا مطالعہ اور اس پر غور و فکر بلا شبہ "ملا" کی اجارہ داری نہیں، مگر اس کے مفہوم اور منشا کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے کچھ ضروری شرائط بہرحال ایسی ہیں جنہیں کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سب سے اہم شرط خلوصِ نیت ہے یعنی ایک انسان کے دل میں فی الواقع منشا الٰہی کو سمجھنے کا جذبہ صادق موجود ہو۔ اگر یہ بات نہ ہوگی تو وہ قرآن مجید کے مطالب کو کبھی بھی ٹھیک طور سے سمجھ نہیں سکے گا بلکہ کلام الٰہی کو اپنے دلپسند افکار و خیالات کی تائید میں استعمال کرتا رہے گا اور اس طرح قرآن پاک سے رشد و ہدایت حاصل کرنے کی بجائے اُس کی تحریف کا مرتکب ہو گا۔

دوسرے قرآنِ حکیم معاذ اللہ کوئی غزلیات کا مجموعہ نہیں کہ ہر صاحبِ ذوق صرف اس کے الفاظ کی معنوی رعایت رکھتے ہوئے اس کے مفہوم کو اپنے ذاتی خیالات اور احساسات کے مطابق متعین کرتا رہے۔ تخیل کی جولانی اشعار کی توجیہ یا نثر کے ادبی پاروں کی توضیح میں تو دکھائی جا سکتی ہے لیکن اس کی کوئی گنجائش کسی ایسے دین کے اندر نہیں نکل سکتی جو فکر و عمل کا ایک ہمہ گیر پروگرام پیش کرتا ہو، اور ایک مخصوص اسلوبِ حیات کا علمبردار ہو۔ اسلام میں بلاشبہ تعبیر کا بھی ایک مقام ہے لیکن اس تعبیر کی چند حدود و قیود ہیں جنہیں اگر نظر انداز کر دیا جائے تو پھر وہ تعبیر تعبیر نہیں رہتی بلکہ تحریف بن جاتی ہے۔ ایک مکمل ضابطہ جو اساسی تصورات سے لیکر حیاتِ انسانی کی معمولی سے معمولی جزئیات پر پوری طرح حاوی ہو اور پھر جس نے نہ صرف انسانوں کو ایک خاص اندازِ فکر عطا کرنے پر قناعت کی ہو بلکہ اس اندازِ فکر کی عملی تعبیر بھی نہایت واضح طور پر پیش کر دی ہو اُس کے اندر جو شخص بھی من مانی تاویلات کرنے کی کوشش کرے گا وہ منہ کی کھائے گا۔ ممکن ہے آپ الفاظ اور جملوں کو اُن کے سیاق و سباق سے الگ کر کے اور اُن کے مفہوم کو توڑ مروڑ کر انہیں اپنے ذوق کے مطابق خاص معانی پہنانے میں کامیاب ہو جائیں لیکن جب لفظ اور جملہ اپنے ساتھ عملی زندگی کا ایک نہایت ہی غیر مبہم پس منظر بھی رکھتا ہو تو پھر آپ اپنے اس مقصد

میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ پس منظر قدم قدم پر آپ کی مزاحمت کریگا اور لوگوں کو بتائیگا کہ آپ یا تو فریب نفس میں مبتلا ہیں یا آپ دوسروں کو فریب دینے کی مذموم کوشش کر رہے ہیں

اس حقیقت کو آپ لہو الحدیث والی آیت سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ قرآن میں جابجا اس امر کی تصریح موجود ہے کہ حضور کا اسوۂ حسنہ ہمارے لیے واجب اتباع ہے۔ اس کی پیروی میں ہی ہماری دنیوی فلاح اور اخروی کامرانی کا راز مضمر ہے۔ حضور سرور دوعالم کے ارشادات آپ کے افعال و اعمال، آپ کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے ہی شریعت کا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے۔ ان کی حیثیت کسی مقدس انسان کے ذاتی اعمال اور رجحانات کی نہیں بلکہ انہیں اپنانے ہی سے ایک شخص کفر کی تاریکی سے نکل کر ایمان کی روشنی میں آتا ہے۔ چنانچہ جن پاکباز انسانوں نے حضور سرور کائنات کی زندگی میں اُن کی آواز پر لبیک کہا۔ انہوں نے ان سارے پہلوؤں میں حضور سرور دوعالمؐ کی پیروی کرنے کی کوشش کی، حضورؐ کے نظریات کے مطابق اپنے نظریات بدلے، حضورؐ کی عادات کی اپنی عملی زندگی میں تصویر اتاری۔ الغرض اُن کی زندگی کا کوئی گوشہ اور اُن کے قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہ تھا جس میں حضورؐ کی تعلیمات کی گہری چھاپ موجود نہ ہو۔

پھر حضورؐ کے بتلائے ہوئے ارشادات کے مطابق اجتماعی زندگی کی تعمیر کی گئی اور یہ سلسلہ کئی سالوں تک قائم رہا۔ عدالتوں کے اندر ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کے مطابق فیصلے ہوتے رہے۔ مسلمانوں کے باہمی لین دین اور تعلقات میں حضورؐ کے اقوال کو ہی آخری اتھارٹی تسلیم کیا جاتا رہا اور آج اس گئی گزری حالت میں بھی ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں خوش نصیب انسان حضورؐ کے ارشادات کی تبلیغ و اشاعت میں ہمہ تن مصروف ہیں اور ان کی خود بھی تعمیل کرتے ہیں اور دوسروں کو تعمیل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ پھر مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کی صورت گری میں اب بھی سنت رسول سے ہی بہت کچھ اخذ کیا جاتا ہے۔ طہارت کے عام مسائل سے لیکر نکاح اور طلاق کے اہم معاملات تک میں احادیث ہی سے ہم رہنمائی حاصل کرتے

ہیں۔ جن ارشادات کے ساتھ ہمارا رشتہ اتنا نازک اور گہرا ہے کہ زندگی کا پہلا سانس لیتے ہی ہمارے کان میں جو آواز سب سے پہلے سنائی دے وہ انہیں ارشادات کی تعمیل ہو اور پھر جسم اور روح کا رشتہ ختم ہو جانے کے بعد ہمارے رفقاء اور رشتہ دار ہماری جو آخری خدمت سرانجام دیں وہ بھی حضورؐ کے فرمائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو۔ حضورؐ کے ارشاد کے مطابق ہی ہمیں ایک خاص طریق سے نہلایا جائے، ایک خاص انداز سے لباس پہنایا جائے اور ایک خاص انداز سے ہماری نماز جنازہ ادا کی جائے، پھر خاص آداب کے ساتھ ہمیں قبر کے سپرد کیا جاتے۔ جس تعلیم کے ہم مہد سے لحد تک ایک ایک قدم پر محتاج ہوں اور جس سے ہم ایک لمحہ کے لیے بھی اغماض نہ برت سکتے ہوں اُس کے بارے میں اگر کوئی بد باطن ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کرے کہ یہ مقدس تعلیم آیاتِ الٰہی سے غافل کرنے کا سبب ہے تو اُس کے اس دعوے کو اگر حماقت اور دیوانگی نہ کہا جائے تو اور کس لفظ سے تعبیر کیا جائے۔ اُس کا یہ دعویٰ اتنا غلط اور احمقانہ ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی اور اُمتِ مُسلمہ کی پوری تاریخ اس کی پوری شدت کے ساتھ تکذیب کرتی ہے۔ جس قوم کے نیک اور خدا ترس افراد کو ابھی تک میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھانے میں تامّل ہو اور اس کی وجہ اُن کے نزدیک بجز اس ایک وجہ کے اور کوئی نہ ہو کہ ہمارے ہادی صلی اللہ علیہ وسلم ایسا نہیں کیا کرتے تھے، وہ قوم بعض سنتوں کو اپنی کم ہمتی کی وجہ سے ترک تو کر سکتی ہے لیکن حدیثِ نبوی کو کبھی بھی دین سے برگشتہ کرنے والی چیز نہیں سمجھ سکتی۔

تیسرے دنیا کے سارے نظامہائے حیات اور سارے علوم و فنون اپنی کچھ مخصوص اصطلاحات رکھتے ہیں۔ یہ اصطلاحات الفاظ کے عام ڈھانچے لیکر اُن میں مفہوم و معانی کی ایک خاص روح پھونک کر تیار کی جاتی ہیں اور اس وجہ سے الفاظ کے ظاہری اشتراک کے باوجود ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اصطلاحات کسی نظام کو دوسرے نظام سے الگ کرنے، اور کسی شعبۂ علم کو دوسرے شعبۂ علم سے ممیز اور ممتاز کرنے میں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ مختلف نظامہائے حیات

اور علوم و فنون کے درمیان جو کچھ امتیاز پیدا ہوتا تھا وہ انہیں کا رہین منت ہے۔ یہ اپنے نظام اور علم کے رخ زیبا کا عکس ہوتی ہیں اس لیے انہیں اس نظام اور علم کی روح کے سمجھے بغیر سمجھنا یکسر ممکن ہے۔ مثال کے طور پر ضابطۂ فوجداری کی ایک اصطلاح ہے CAPITAL PUNISHMENT جس کے معنی ہیں "سزائے موت" اب ایک سر پھرا اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ چونکہ CAPITAL کے معنی لغت میں "سرمایہ" کے بھی ہیں لہٰذا اس سے مراد سزائے موت نہیں بلکہ صرف جرمانہ ہے۔ جو شخص لغت کی مدد سے اس قسم کی مضحکہ خیز تاویلات کریگا اُسے پوری دنیا فاترالعقل کہے گی۔ بالکل اسی طرح اُن لوگوں کے فہم و فراست کا بھی دیوالہ نکل چکا ہے جو قرآن مجید کو حضور سرورِ دو عالم کی تصریحات کے بغیر محض لغت کے سہارے سمجھنے کا داعیہ رکھتے ہیں وہ سادہ لوح نوجوانوں کو پھنسانے کے لیے بڑے معصومانہ انداز میں یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کو زمان و مکان کی حد بندیوں میں محدود نہیں کیا جا سکتا اور اس کے دائرہ کو اصطلاحات کی حدود سے تنگ کرنا اس پر صریح ظلم و زیادتی ہے۔ یہ بات بظاہر اسلام کی آفاقیت ثابت کرنے کے لیے کہی جاتی ہے لیکن اس کی تہ میں ایک خوفناک سازش موجود ہے۔ ہمیں تو آج تک کوئی ایسا مسلمان نہیں ملا جو قرآن مجید کے پس منظر کا اس لیے مطالعہ کرتا ہو کہ اسے ایک خاص دور کے اندر مقید کر دیا جائے اور اب اس کی تعلیمات کی حیثیت قصۂ پارینہ کی بنا دی جائے۔ قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہوئے اگر اس کے دورِ نزول کے حالات کو سامنے رکھا جاتا ہے تو اُس کی غرض یہی ہوتی ہے کہ ہم اس کے مفہوم و منشا کو صحیح طور پر سمجھ سکیں کیونکہ جو ضابطۂ حیات عملی زندگی سے جتنا گہرا تعلق رکھتا ہے اس کا صحیح صحیح مفہوم زندگی کے عملی نقشہ کو سامنے رکھ کر ہی متعین کیا جا سکتا ہے۔ پھر اسلام نے اس کی اصطلاحات نے اس کے دائرہ کو تنگ نہیں کیا بلکہ اس دین کو دوسرے ادیان اور نظامہائے حیات سے ممیز اور ممتاز کیا ہے۔ ایمان بالغیب، صلوٰۃ، زکوٰۃ، آخرت، حشر، نشر، نکاح، طلاق اور اسی طرح کی جو سینکڑوں اصطلاحات قرآن مجید میں استعمال کی گئی ہیں اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ان کے سامنے آنے کے ساتھ قلب و دماغ میں ایک خاص اندازِ فکر پیدا ہو اور پھر اس کے ساتھ ساتھ وہ عملی نقشہ بھی اُبھر کر آنکھوں کے سامنے آ جائے جسے اسی اندازِ فکر نے پیکرِ محسوس عطا کیا ہے۔ (باقی صفحہ ۶۲ پر)

تفہیم القرآن

سبا

(۲)

اور سلیمان کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا، صبح کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک اور شام کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک[۱۷]۔ ہم نے اُس کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ بہا دیا[۱۸] اور ایسے جن اس کے تابع کر دیے جو اپنے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے[۱۹]۔ اُن میں سے جو ہمارے حکم سے سرتابی کرتا اس کو ہم بھڑکتی ہوئی آگ کا مزہ چکھاتے۔ وہ اُس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا، اونچی عمارتیں، تصویریں[۲۰]، بڑے بڑے

۱۷؎ یہ مضمون بھی سورۂ انبیاء آیت ۸۱ میں گزر چکا ہے اور اس کی تشریح وہاں کی جا چکی ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۱۷۶ - ۱۷۷)

۱۸؎ بعض قدیم مفسرین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ زمین سے ایک چشمہ حضرت سلیمانؑ کے لیے پھوٹ نکلا تھا جس میں سے پانی کے بجائے پگھلا ہوا تانبہ بہتا تھا۔ لیکن آیت کی دوسری تاویل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں تانبے کو پگھلانے اور اس سے طرح طرح کی چیزیں بنانے کا کام اتنے بڑے پیمانے پر کیا گیا کہ گویا وہاں تانبے کے چشمے بہ رہے تھے۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۱۷۶)

۱۹؎ یہ جن جو حضرت سلیمان کے لیے مسخر کیے گئے تھے، آیا یہ دیہقانی اور کوہستانی انسان تھے یا واقعی وہی جن تھے جو ایک پوشیدہ مخلوق کی حیثیت سے دنیا بھر میں معروف ہیں، اس مسئلے پر بھی سورۂ انبیاء اور سورۂ نمل کی تفسیر میں ہم مفصل بحث کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، صفحات ۱۷۷-۱۷۸، ۵۶۲، ۵۶۴-۵۶۵، ۵۷۵- ۵۷۶ - ۵۷۹)

نـ ۱۸ اصل میں لفظ تَمَاثِیل استعمال ہوا ہے جو تِمثَال کی جمع ہے۔ تمثال عربی زبان میں ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو کسی قدرتی شئے کے مشابہ بنائی جائے، قطع نظر اس سے کہ وہ کوئی انسان ہو یا حیوان، کوئی درخت ہو یا پھول یا دریا یا کوئی دوسری بے جان چیز۔ التِّمثَال اسم للشئ المصنوع مشبّھا بخلق من خلق اللہ (لسان العرب)۔ "تمثال نام ہے ہر اس مصنوعی چیز کا جو خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کے مانند بنائی گئی ہو"۔ التمثال کل ما صوّر علٰی صورۃ غیرہ من حیوان وغیر حیوان (تفسیر کشاف)۔ "تمثال ہر اس تصویر کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کی صورت کے مماثل بنائی گئی ہو، خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان"۔ اس بنا پر قرآن مجید کے اس بیان سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے جو "تماثیل" بنائی جاتی تھیں وہ ضرور انسانوں اور حیوانوں کی تصاویر یا ان کے مجسّمے ہی ہونگے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پھول پتّیاں اور قدرتی مناظر اور مختلف قسم کے نقش و نگار ہوں جن سے حضرت سلیمان نے اپنی عمارتوں کو آراستہ کرایا ہو۔

غلط فہمی کا منشا بعض مفسّرین کے یہ بیانات ہیں کہ حضرت سلیمان نے انبیاء اور ملائکہ کی تصویریں بنوائی تھیں۔ یہ باتیں ان حضرات نے بنی اسرائیل کی روایات سے اخذ کرلیں اور پھر ان کی توجیہ یہ کی کہ پچھلی شریعتوں میں اس قسم کی تصویریں بنانا ممنوع نہ تھا۔ لیکن ان روایات کو بلا تحقیق نقل کرتے ہوئے ان بزرگوں کو یہ خیال نہ رہا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جس شریعتِ موسوی کے پیرو تھے اس میں بھی انسانی اور حیوانی تصاویر اور مجسّمے اسی طرح حرام تھے جس طرح شریعتِ محمدیہ میں حرام ہیں۔ اور بنی اسرائیل کے ایک گروہ کو حضرت سلیمانؑ سے جو عداوت تھی اس کی بنا پر انہوں نے آنجناب کو شرک و بت پرستی، اور جادوگری اور زنا کے بدترین الزامات سے متہم کیا ہے، اس لیے ان کی روایات پر اعتماد کرکے اس جلیل القدر پیغمبر کے بارے میں کوئی ایسی بات ہرگز قبول نہ کرنی چاہیے جو خدا کی بھیجی ہوئی کسی شریعت کے خلاف پڑتی ہو۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ حضرت موسیٰ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بنی اسرائیل میں جتنے انبیاء بھی آئے ہیں وہ سب توراۃ کے پیرو تھے اور ان میں سے کوئی بھی نئی شریعت نہ لایا تھا جو توراۃ کے قانون کی ناسخ ہوتی۔ اب توراۃ کو دیکھیے تو اس میں بار بار بصراحت

یہ حکم ملتا ہے کہ انسانی اور حیوانی تصویریں اور مجسمے قطعاً حرام ہیں:

"تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے" (خروج - باب ۲۰ - آیت ۴)

"تم اپنے لیے بت نہ بنانا اور نہ تراشی ہوئی مورت یا لاٹ اپنے لیے کھڑی کرنا اور نہ اپنے ملک میں کوئی شبیہ دار پتھر رکھنا کہ اسے سجدہ کرو" (احبار - باب ۲۶ آیت ۱)

"تا نہ ہو کہ تم بگڑ کر کسی شکل یا صورت کی کھودی ہوئی مورت اپنے لیے بنا لو جس کی شبیہ کسی مرد یا عورت یا زمین کے کسی حیوان یا ہوا میں اڑنے والے کسی پرند یا زمین میں رینگنے والے جاندار یا مچھلی سے جو زمین کے نیچے پانی میں رہتی ہے ملتی ہو" (استثناء باب ۴ آیت ۱۶ - ۱۸)

"لعنت اس آدمی پر جو کاریگری کی صنعت کی طرح کھودی ہوئی یا ڈھالی ہوئی مورت بنا کر جو خداوند کے نزدیک مکروہ ہے اس کو کسی پوشیدہ جگہ میں نصب کرے" (استثناء - باب ۲۷ - آیت ۱۵)

ان صاف اور صریح احکام کے بعد یہ بات کیسے مانی جاسکتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے انبیاء اور ملائکہ کی تصویریں یا ان کے مجسمے بنانے کا کام جنوں سے لیا ہوگا۔ اور یہ بات آخر اُن یہودیوں کے بیان پر اعتماد کر کے کیسے تسلیم کرلی جائے جو حضرت سلیمانؑ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ اپنی مشرک بیویوں کے عشق میں مبتلا ہو کر بت پرستی کرنے لگے تھے (۱ - سلاطین - باب ۱۱)

تاہم مفسرین نے بنی اسرائیل کی یہ روایات نقل کرنے کے ساتھ اس امر کی بھی صراحت کردی تھی کہ شریعتِ محمدیہ میں یہ فعل حرام ہے اس لیے اب کوئی شخص حضرت سلیمانؑ کی پیروی میں تصویریں اور مجسمے بنانے کا مجاز نہیں ہے۔ لیکن موجودہ زمانے کے بعض لوگوں نے جو اہلِ مغرب کی تقلید میں مصوری و بت تراشی کو حلال کرنا چاہتے ہیں، قرآن مجید کی اس آیت کو اپنے لیے دلیل ٹھیرا لیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ جب ایک پیغمبر نے یہ کام کیا اور اللہ تعالیٰ نے خود اپنی کتاب میں اس کے اس فعل کا ذکر کیا اور اس پر کسی ناپسندیدگی

کا اظہار بھی نہ فرمایا تو اسے لازماً حلال ہی ہونا چاہیے۔

ان مقلدینِ مغرب کا یہ استدلال دو وجوہ سے غلط ہے۔ اوّل یہ کہ لفظ تماثیل جو قرآن مجید میں استعمال کیا گیا ہے، انسانی اور حیوانی تصاویر کے معنی میں صریح نہیں ہے، بلکہ اس کا اطلاق غیر جاندار اشیاء کی تصویروں پر بھی ہوتا ہے، اس لیے محض اس لفظ کے سہارے یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ قرآن کی رو سے انسانی اور حیوانی تصاویر حلال ہیں۔ دوسرے یہ کہ نہایت کثیر التعداد اور قوی الاسناد اور متواتر المعنیٰ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی روح اشیاء کی تصویریں بنانے اور رکھنے کو قطعی حرام قرار دیا ہے۔ اس معاملہ میں جو ارشادات حضورؐ سے ثابت ہیں اور جو آثار اکابرِ صحابہ سے منقول ہوئے ہیں انہیں ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

۱۔ عن عائشة ام المومنین ان ام حبیبة وام سلمة ذکرتا کنیسة رأینھا بالحبشة فیھا تصاویر فذکرتا للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال ان اولٰئک اذا کان فیھم الرجل الصالح فمات بنوا علی قبرہ مسجدا وصوروا فیہ تلک الصور فاولٰئک شرار الخلق عند اللہ یوم القیٰمة (بخاری، کتاب الصلوٰۃ۔ مسلم، کتاب المساجد۔ نسائی، کتاب المساجد۔)

ام المومنین حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ حضرت ام حبیبہ اور حضرت ام سلمہ نے حبش میں ایک کنیسہ دیکھا تھا جس میں تصویریں تھیں۔ اس کا ذکر انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ حضورؐ نے فرمایا ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ جب ان میں کوئی صالح شخص ہوتا تو اس کے مرنے کے بعد وہ اس کی قبر پر ایک عبادت گاہ بناتے اور اس میں یہ تصویریں بنا لیا کرتے تھے۔ یہ لوگ قیامت کے روز اللہ کے نزدیک بدترینِ خلائق قرار پائیں گے۔

۲۔ عن ابی جحیفة ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعن المصوّر (بخاری، کتاب البیوع، کتاب الطلاق، کتاب اللباس)

ابو جحیفہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصوّر پر لعنت فرمائی ہے۔

۳۔ عن ابی زرعة قال دخلتُ

ابو زرعہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت ابو ہریرہؓ

مع ابی هریرة دارًا بالمدینة فرأی اعلاها مصورًا یصور، قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول ومن اظلم ممن ذهب یخلق کخلقی فلیخلقوا حبة و لیخلقوا ذرة (بخاری، کتاب اللباس، مسند احمد اور مسلم کی روایت میں تصریح ہے کہ یہ مروان کا گھر تھا)

کے ساتھ ایک مکان میں داخل ہوا تو دیکھا کہ مکان کے اوپر ایک مصور تصویریں بنا رہا ہے۔ اس پر حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو میری تخلیق کے مانند تخلیق کی کوشش کرے۔ یہ لوگ ایک دانہ یا ایک چیونٹی تو بنا کر دکھائیں۔

۴۔ عن ابی محمد الهذلی عن علی قال کان رسول الله صلی الله علیه وسلم فی جنازة فقال ایکم ینطلق الی المدینة فلا یدع بها وثنًا الا کسرہ ولا قبرًا الا سوّاہ ولا صورة الا لطخها۔ فقال رجل انا یا رسول الله فانطلق فهاب اهل المدینة۔ فرجع۔ فقال علی انا انطلق یا رسول الله۔ قال فانطلق۔ فانطلق ثم رجع۔ فقال یا رسول الله لم ادع بها وثنًا الا کسرته ولا قبرًا الا سویته ولا صورة الا لطختها۔ ثم قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من عاد لصنعة شئ من هذا فقد کفر بما انزل علی محمد (مسند احمد، مسلم کتاب الجنائز اور نسائی کتاب الجنائز میں بھی اس مضمون کی ایک

ابو محمد ہذلی حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازے میں شریک تھے۔ آپ نے فرمایا تم لوگوں میں سے کون ہے جو جا کر مدینہ میں کوئی بت نہ چھوڑے جسے توڑ نہ دے اور کوئی قبر نہ چھوڑے جسے زمین کے برابر نہ کر دے اور کوئی تصویر نہ چھوڑے جسے مٹا نہ دے۔ ایک شخص نے عرض کیا میں اس کے لیے حاضر ہوں۔ چنانچہ وہ گیا مگر اہل مدینہ کے خوف سے یہ کام کیے بغیر پلٹ آیا۔ پھر حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں جاتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا اچھا تم جاؤ۔ حضرت علیؓ گئے اور واپس آ کر انہوں نے عرض کیا کہ میں نے کوئی بت نہیں چھوڑا جسے توڑ نہ دیا ہو۔ کوئی قبر نہیں چھوڑی جسے زمین کے برابر نہ کر دیا ہو اور کوئی تصویر نہیں چھوڑی جسے مٹا نہ دیا ہو۔ اس پر حضورؐ نے

حدیث منقول ہوئی ہے) فرمایا اب اگر کسی شخص نے ان چیزوں میں سے کوئی چیز بنائی تو اس نے اس تعلیم سے کفر کیا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم، پر نازل ہوئی ہے۔

۵ ـ عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۔ ۔ ۔ ومن صور صورۃ عذب وکلف ان ینفخ فیھا ولیس بنافخ (بخاری۔ کتاب التعبیر۔ ترمذی، ابواب اللباس۔ نسائی۔ کتاب الزینۃ۔ مسند احمد۔)

ابن عباس نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ اور جس شخص نے تصویر بنائی اسے عذاب دیا جائے گا اور مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس میں روح پھونکے اور وہ نہ پھونک سکے گا۔

۶ ـ عن سعید بن ابی الحسن قال کنت عند ابن عباس رضی اللہ عنہما اذ اتاہ رجل فقال یا ابا عباس انی انسان انما معیشتی من صنعۃ یدی وانی اصنع ھذہ التصاویر۔ فقال ابن عباس لا احدثک الا ما سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول سمعتہ یقول من صور صورۃ فان اللہ معذبہ حتی ینفخ فیھا الروح ولیس بنافخ فیھا ابدا۔ فربا الرجل ربوۃ شدیدۃ واصفر وجھہ۔ فقال ویحک ان ابیت الا ان تصنع فعلیک بھذا الشجر کل شیء لیس فیہ روح (بخاری، کتاب البیوع۔ مسلم، کتاب اللباس۔ نسائی، کتاب الزینۃ۔ مسند احمد۔)

سعید بن ابی الحسن کہتے ہیں کہ میں ابن عباس کے پاس بیٹھا تھا۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ اے ابو عباس میں ایک ایسا شخص ہوں جو اپنے ہاتھ سے روزی کماتا ہے اور میرا روزگار یہ تصویریں بنانا ہے۔ ابن عباس نے جواب دیا کہ میں تم سے وہی بات کہونگا جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنی ہے۔ میں نے حضور سے یہ بات سنی ہے کہ جو شخص تصویر بنائے گا اللہ اسے عذاب دیگا اور اسے نہ چھوڑیگا جب تک وہ اس میں روح نہ پھونکے، اور وہ کبھی روح نہ پھونک سکے گا۔ یہ بات سن کر وہ شخص سخت برافروختہ ہوا اور اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس پر ابن عباس نے کہا بندۂ خدا، اگر تجھے تصویر بنانی ہی ہے تو اس درخت کی بنا، یا کسی ایسی چیز

کی بنا جس میں روح نہ ہو۔

۷۔ عن عبد اللہ بن مسعود قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان اشد الناس عذابا عند اللہ یوم القیمۃ المصورون (بخاری، کتاب اللباس۔ مسلم، کتاب اللباس۔ نسائی، کتاب الزینۃ۔ مسند احمد)

عبد اللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے روز اللہ کے ہاں سخت ترین سزا پانے والے مصور ہوں گے۔

۸۔ عن عبد اللہ بن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان الذین یصنعون ھذہ الصور یعذبون یوم القیمۃ یقال لھم احیوا ما خلقتم (بخاری، کتاب اللباس۔ مسلم، کتاب اللباس۔ نسائی، کتاب الزینۃ۔ مسند احمد)

عبد اللہ بن عمرؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو لوگ یہ تصویریں بناتے ہیں ان کو قیامت کے روز عذاب دیا جائیگا ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے اسے زندہ کرو۔

۹۔ عن عائشۃ رضی اللہ عنہا انھا اشترت نمرقۃ فیھا تصاویر فقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالباب ولم یدخل فقلت اتوب الی اللہ مما اذنبت قال ما ھذہ النمرقۃ قلت لتجلس علیھا وتوسدھا قال ان اصحاب ھذہ الصور یعذبون یوم القیامۃ یقال لھم احیوا ما خلقتم وان الملائکۃ لا تدخل بیتا فیہ الصورۃ (بخاری، کتاب اللباس، مسلم،

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک تکیہ خریدا جس میں تصویریں بنی ہوئی تھیں پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور دروازے ہی میں کھڑے ہو گئے۔ اندر داخل نہ ہوئے۔ میں نے عرض کیا کہ میں خدا سے توبہ کرتی ہوں ہر اس گناہ پر جو میں نے کیا ہو۔ حضور نے فرمایا یہ تکیہ کیسا ہے؟ میں نے عرض کیا یہ اس غرض کے لیے ہے کہ آپ یہاں تشریف رکھیں اور اس پر ٹیک لگائیں فرمایا: ان تصویروں کے بنانے والوں کو قیامت کے

کتاب اللباس۔ نسائی، کتاب الزینۃ۔ ابن ماجہ، کتاب التجارات۔ مؤطا، کتاب الاستیذان)

روز عذاب دیا جائیگا۔ ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے اس کو زندہ کرو۔ اور ملائکہ (یعنی ملائکۂ رحمت) کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویریں ہوں۔

۱۰۔ عن عائشۃ قالت دخل علیّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانا متسترۃ بقرام فیہ صورۃ فتلون وجہہ ثم تناول الستر فھتکہ ثم قال ان من اشد الناس عذابًا یوم القیمۃ الذین یشبھون بخلق اللہ (مسلم۔ کتاب اللباس۔ بخاری، کتاب اللباس۔ نسائی، کتاب الزینۃ۔)

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے اور میں نے ایک پردہ لٹکا رکھا تھا جس میں تصویر تھی۔ آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، پھر آپ نے اس پردے کو لیکر پھاڑ ڈالا اور فرمایا قیامت کے روز سخت ترین عذاب جن لوگوں کو دیا جائے گا ان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ کی تخلیق کے مانند تخلیق کی کوشش کرتے ہیں۔

۱۱۔ عن عائشۃ قالت قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من سفر وقد سترت علی بابی درنوکًا فیہ الخیل ذوات الاجنحۃ فامرنی فنزعتہ (مسلم، کتاب اللباس۔ نسائی، کتاب الزینۃ۔)

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس تشریف لائے اور میں نے اپنے دروازے پر ایک پردہ لٹکا رکھا تھا جس میں پردار گھوڑوں کی تصویریں تھیں۔ حضور نے حکم دیا کہ اسے اتار دو اور میں نے اتار دیا۔

۱۲۔ عن جابر قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الصورۃ فی البیت ونھی ان یصنع ذالک (ترمذی، ابواب اللباس۔)

جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمادیا کہ گھر میں تصویر رکھی جائے اور اس سے بھی منع فرمادیا کہ کوئی شخص تصویر بنائے۔

۱۳۔ عن ابن عباس عن ابی طلحۃ

ابن عباس ابو طلحہ انصاری سے روایت کرتے ہیں

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لاتدخل الملائکۃ بیتاً فیہ کلب ولا صورۃ (بخاری، کتاب اللباس۔)

کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ملائکہ (یعنی ملائکہ رحمت)، کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا پلا ہوا ہو اور نہ ایسے گھر میں جس میں تصویر ہو۔

۱۴۔ عن عبداللہ بن عمر قال وعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم جبریل فراث علیہ حتی اشتد علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فخرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلقیہ فشکا الیہ ما وجد فقال لہ انا لاندخل بیتاً فیہ صورۃ ولا کلب۔ (بخاری، کتاب اللباس۔ اس مضمون کی متعدد روایات بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، امام مالک اور امام احمد نے متعدد صحابہ سے نقل کی ہیں)

عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ جبریل نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کا وعدہ کیا مگر بہت دیر لگ گئی اور وہ نہ آئے۔ حضور کو اس سے پریشانی ہوئی اور آپ گھر سے نکلے تو وہ مل گئے۔ آپ نے ان سے شکایت کی تو انہوں نے کہا ہم کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا ہو یا تصویر ہو۔

ان روایات کے مقابلے میں کچھ روایتیں ایسی بھی پیش کی جاتی ہیں جن میں تصاویر کے معاملہ میں رخصت پائی جاتی ہے۔ مثلاً ابوطلحہ انصاری کی یہ روایت کہ جس کپڑے میں تصویر کڑھی ہوئی ہو اس کا پردہ لٹکانے کی اجازت ہے (بخاری، کتاب اللباس)۔ اور حضرت عائشہ کی یہ روایت کہ تصویردار کپڑے کو پھاڑ کر جب انہوں نے گدا بنا لیا تو حضورؐ نے اسے بچھانے سے منع نہ فرمایا (مسلم، کتاب اللباس) اور سالم بن عبداللہ بن عمر کی یہ روایت کہ ممانعت اس تصویر کی ہے جو نمایاں مقام پر نصب کی گئی ہو نہ کہ اس تصویر کی جو فرش کے طور پر بچھا دی گئی ہو (مسند احمد)۔ لیکن ان میں سے کوئی حدیث بھی دراصل ان احادیث کی تردید نہیں کرتی جو اوپر نقل کی گئی ہیں۔ جہاں تک تصویر بنانے کا تعلق ہے اس کا جواز ان میں سے کسی حدیث سے بھی نہیں نکلتا۔ یہ احادیث صرف اس مسئلے سے بحث کرتی ہیں کہ اگر کسی کپڑے پر تصویر بنی ہوئی ہو اور آدمی اس کو لے چکا ہو تو کیا کرے۔ اس باب میں ابوطلحہ انصاری والی روایت کسی طرح

بھی قابلِ قبول نہیں ہے، کیونکہ وہ بکثرت دوسری صحیح احادیث سے ٹکراتی ہے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویردار کپڑا لٹکانے سے نہ صرف منع فرمایا ہے بلکہ اسے پھاڑ دیا ہے۔ نیز خود حضرت ابو طلحہ کا اپنا عمل جو ترمذی اور مؤطا میں منقول ہوا ہے وہ یہ ہے کہ تصویردار پردہ لٹکانا تو درکنار وہ ایسا فرش بچھانے میں بھی کراہت محسوس کرتے تھے جس میں تصاویر ہوں۔ رہیں حضرت عائشہ اور سالم بن عبداللہ کی روایات تو ان سے صرف اتنا جواز نکلتا ہے کہ اگر تصویر احترام کی جگہ پر نہ ہو بلکہ ذلت کے ساتھ فرش میں رکھی جائے اور اسے پامال کیا جائے تو وہ قابلِ برداشت ہے۔ ان احادیث سے آخر اُس پوری ثقافت کا جواز کیسے نکالا جا سکتا ہے جو تصویر کشی اور مجسمہ سازی کے آرٹ کو تہذیبِ انسانی کا قابلِ فخر کمال قرار دیتی ہے اور اسے مسلمانوں میں رواج دینا چاہتی ہے۔

تصاویر کے معاملہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر کار امت کے لیے جو ضابطہ چھوڑا ہے اس کا پتہ اکابر صحابہ کے اُس طرزِ عمل سے چلتا ہے جو انہوں نے اس باب میں اختیار کیا۔ اسلام میں یہ اصول مسلّم ہے کہ معتبر اسلامی ضابطہ وہی ہے جو تمام تدریجی احکام اور ابتدائی رخصتوں کے بعد حضورؐ نے اپنے آخر عہد میں مقرر کر دیا ہو۔ اور حضورؐ کے بعد اکابر صحابہ کا کسی طریقے پر عملدرآمد کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اسی طریقے پر حضورؐ نے امت کو چھوڑا تھا۔ اب دیکھیے کہ تصویروں کے ساتھ اس مقدس گروہ کا کیا برتاؤ تھا۔

قال عمر رضی اللہ عنہ انا لاندخل کنائسکم من اجل التماثیل التی فیھا الصُّوَر (بخاری کتاب الصلوٰۃ)

حضرت عمرؓ نے عیسائیوں سے کہا کہ ہم تمہارے کنیسوں میں اس لیے داخل نہیں ہوتے کہ ان میں تصویریں ہیں۔

کان ابن عباس یصلی فی بیعۃ الا بیعۃ فیھا تماثیل۔ (بخاری، کتاب الصلوٰۃ)

ابن عباس گرجا میں نماز پڑھ لیتے تھے، مگر کسی ایسے گرجا میں نہیں جس میں تصویریں ہوں۔

عن ابی الھیاج الاسدی، قال لی علی الا ابعثک علی ما بعثنی علیہ

ابو الہیاج اسدی کہتے ہیں کہ حضرت علی نے مجھ سے کہا کیا نہ بھیجوں میں تم کو اس مہم پر جس پر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا تدع تمثالاً الا طمستہ ولا قبراً مشرفاً الا سویتہ ولا صورۃ الا طمستہا (مسلم، کتاب الجنائز۔ نسائی، کتاب الجنائز)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا؟ اور وہ یہ ہے کہ تم کوئی مجسمہ نہ چھوڑو جسے توڑ نہ دو، اور کوئی اونچی قبر نہ چھوڑو جسے زمین کے برابر نہ کردو اور کوئی تصویر نہ چھوڑو جسے مٹا نہ دو۔

عن حنش الکنانی عن علی انہ بعث عامل شرطتہ فقال لہ اتدری علی ما ابعثک؟ علی ما بعثنی علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان انحت کل صورۃ وان اسوی کل قبر (مسند احمد)

حنش الکنانی کہتے ہیں کہ حضرت علی نے اپنی پولیس کے کوتوال سے کہا کہ تم جانتے ہو میں کس مہم پر تمہیں بھیج رہا ہوں؟ اس مہم پر جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا۔ یہ کہ میں ہر تصویر کو مٹا دوں اور ہر قبر کو زمین کے برابر کردوں۔

اسی ثابت شدہ اسلامی ضابطہ کو فقہائے اسلام نے تسلیم کیا ہے اور اسے قانون اسلامی کی ایک دفعہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ بدرالدین عینی توضیح کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"ہمارے اصحاب (یعنی فقہائے احناف) اور دوسرے فقہاء کہتے ہیں کہ کسی جاندار چیز کی تصویر بنانا حرام ہی نہیں، سخت حرام اور کبیرہ گناہوں میں سے ہے، خواہ بنانے والے نے اسے کسی ایسے استعمال کے لیے بنایا ہو جس میں اس کی تذلیل ہو، یا کسی دوسری غرض کے لیے۔ ہر حالت میں تصویر کشی حرام ہے کیونکہ اس میں اللہ کی تخلیق سے مشابہت ہے۔ اسی طرح تصویر خواہ کپڑے میں ہو یا فرش میں یا دینار یا درہم یا پیسے میں یا کسی برتن میں یا دیوار میں، بہر حال اس کا بنانا حرام ہے۔ البتہ جاندار کے سوا کسی دوسری چیز مثلاً درخت وغیرہ کی تصویر بنانا حرام نہیں ہے۔ ان تمام امور میں تصویر کے سایہ دار ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہی رائے امام مالک، سفیان ثوری، امام ابو حنیفہ اور دوسرے علماء کی ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ اس سے لڑکیوں کی گڑیاں مستثنیٰ ہیں مگر امام مالک ان کے خریدنے کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ (عمدۃ القاری۔ ج ۲۲ ص ۷۰۔ اسی

مسلک کو امام نووی نے شرح مسلم میں زیادہ تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو شرح نووی، مطبوعہ مصر، ج ۱۴، ص ۸۱-۸۲)

یہ تو ہے تصویر سازی کا حکم۔ رہا دوسرے کی بنائی ہوئی تصویر کے استعمال کا مسئلہ تو اس کے بارے میں فقہائے اسلام کے مسالک علامہ ابن حجر نے اس طرح نقل کیے ہیں:۔

"مالکی فقیہ ابن عربی کہتے ہیں کہ جس تصویر کا سایہ پڑتا ہو اس کے حرام ہونے پر تو اجماع ہے قطع نظر اس سے کہ وہ تحقیر کے ساتھ رکھی گئی ہو یا نہ۔ اس اجماع سے صرف لڑکیوں کی گڑیاں مستثنیٰ ہیں۔ . . . . ابن عربی یہ بھی کہتے ہیں کہ جس تصویر کا سایہ نہ پڑتا ہو وہ اگر اپنی حالت پر باقی رہے (یعنی آئینہ کی پرچھائیں کی طرح نہ ہو بلکہ چھپی ہوئی تصویر کی طرح ثابت و قائم ہو) تو وہ بھی حرام ہے، خواہ اسے حقارت کے ساتھ رکھا گیا ہو یا نہ۔ البتہ اگر اس کا سر کاٹ دیا گیا ہو یا اس کے اجزاء الگ الگ کر دیئے گئے ہوں تو اس کا استعمال جائز ہے۔ . . . . . .

امام الحرمین نے ایک مسلک یہ نقل کیا ہے کہ پردے یا تکیے پر اگر تصویر ہو تو اس کے استعمال کی اجازت ہے، مگر دیوار یا چھت میں جو تصویر لگائی جائے وہ ممنوع ہے کیونکہ اس صورت میں اس کا اعزاز ہوگا، بخلاف اس کے پردے اور تکیے کی تصویر حقارت سے رہے گی . . . . . . ابن ابی شیبہ نے عکرمہ سے نقل کیا ہے کہ زمانۂ تابعین کے علماء یہ رائے رکھتے تھے کہ فرش اور تکیے میں تصویر کا ہونا اس کے لیے باعثِ ذلت ہے۔ نیز ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اونچی جگہ پر جو تصویر لگائی گئی ہو وہ حرام ہے اور قدموں میں جسے پامال کیا جاتا ہو وہ جائز ہے۔ یہی رائے ابن سیرین، سالم بن عبداللہ، عکرمہ بن خالد اور سعید بن جبیر سے بھی منقول ہے۔"

(فتح الباری، ج ۱۰، ص ۳۰۰)

اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں تصاویر کی حرمت کوئی مختلف فیہ

یا مشکوک مسئلہ نہیں ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح ارشادات، صحابہ کرام کے عمل اور فقہائے اسلام کے متفقہ فتاویٰ کی رُو سے ایک مسلّم قانون ہے جسے آج بیرونی ثقافتوں سے متاثر لوگوں کی موشگافیاں بدل نہیں سکتیں۔

اس سلسلے میں چند باتیں اور بھی سمجھ لینی ضروری ہیں تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی باقی نہ رہے۔

بعض لوگ فوٹو اور ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر میں فرق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ شریعت بجائے خود تصویر کو حرام کرتی ہے نہ کہ تصویر سازی کے کسی خاص طریقے کو۔ فوٹو اور دستی تصویر میں تصویر ہونے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے درمیان جو کچھ بھی فرق ہے وہ طریقِ تصویر سازی کے لحاظ سے ہے، اور اس لحاظ سے شریعت نے احکام میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔

بعض لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام میں تصویر کی حرمت کا حکم محض شرک و بت پرستی کو روکنے کی خاطر دیا گیا تھا، اور اب اس کا کوئی خطرہ نہیں ہے، لہٰذا یہ حکم باقی نہ رہنا چاہیے۔ لیکن یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ اوّل تو احادیث میں کہیں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ تصاویر صرف شرک و بُت پرستی کے خطرے سے بچانے کے لیے حرام کی گئی ہیں۔ دوسرے، یہ دعویٰ بھی بالکل بے بنیاد ہے کہ اب دنیا میں شرک و بت پرستی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ آج خود برعظیم ہند و پاکستان میں کروڑوں بُت پرست مشرکین موجود ہیں، دنیا کے مختلف خطوں میں طرح طرح سے شرک ہو رہا ہے، عیسائی اہلِ کتاب بھی حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ اور اپنے متعدد اولیاء کی تصاویر اور مجسموں کو پوج رہے ہیں، حتیٰ کہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی مخلوق پرستی کی آفتوں سے محفوظ نہیں ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ صرف وہ تصویریں ممنوع ہونی چاہییں جو مشرکانہ نوعیت کی ہیں یعنی ایسے اشخاص کی تصاویر اور مجسّمے جن کو معبود بنا لیا گیا ہو، باقی دوسری تصویروں اور مجسّموں کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن اس طرح کی باتیں کرنے والے دراصل شارع کے احکام و ارشادات سے قانون اخذ کرنے کے بجائے آپ ہی اپنے شارع بن بیٹھتے ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ تصویر صرف ایک شرک و بت پرستی ہی کی موجب نہیں بنتی، بلکہ دنیا میں دوسرے بہت سے فتنوں کی موجب بھی بنی ہے اور بن رہی ہے۔ تصویر ان بڑے ذرائع میں سے ایک ہے جن سے بادشاہوں

ڈکٹیٹروں اور سیاسی لیڈروں کی عظمت کا سکہ عوام الناس کے دماغوں پر بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے تصویر کو دنیا میں شہوانیت پھیلانے کے لیے بھی بہت بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا ہے اور آج یہ فتنہ ہر زمانے سے زیادہ برسرِ عروج ہے۔ تصاویر قوموں میں نفرت اور عداوت کے بیج بونے، فساد ڈلوانے اور عام لوگوں کو طرح طرح سے گمراہ کرنے کے لیے بھی بکثرت استعمال کی جاتی رہی ہیں اور آج سب سے زیادہ استعمال کی جا رہی ہیں۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ شارع نے تصویر کی حرمت کا حکم صرف بت پرستی کے استیصال کی خاطر دیا ہے، اصلاً غلط ہے۔ شارع نے مطلقاً جاندار اشیاء کی تصویر کو رد کیا ہے۔ ہم اگر خود شارع نہیں بلکہ شارع کے تبع ہیں تو ہمیں علی الاطلاق اس سے رک جانا چاہیے۔ ہمارے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کوئی علتِ حکم خود تجویز کر کے اُس کے لحاظ سے بعض تصویروں کو حرام اور بعض کو حلال قرار دینے لگیں۔

بعض لوگ چند بظاہر بالکل بے ضرر قسم کی تصاویر کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ آخر ان میں کیا خطرہ ہے یہ تو شرک اور شہوانیت اور فساد انگیزی اور سیاسی پروپیگنڈے اور ایسے ہی دوسرے مفسدات سے قطعی پاک ہیں، پھر ان کے ممنوع ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اس معاملہ میں لوگ پھر وہی غلطی کرتے ہیں کہ پہلے علتِ حکم خود تجویز کر لیتے ہیں اور اس کے بعد یہ سوال کرتے ہیں کہ جب فلاں چیز میں یہ علت نہیں پائی جاتی تو وہ کیوں ناجائز ہے۔ علاوہ بریں یہ لوگ اسلامی شریعت کے اس قاعدے کو بھی نہیں سمجھتے کہ وہ حلال اور حرام کے درمیان ایسی دھندلی اور مُبہم حد بندیاں قائم نہیں کرتی جن سے آدمی یہ فیصلہ نہ کر سکتا ہو کہ وہ کہاں تک جواز کی حد میں ہے اور کہاں اُس حد کو پار کر گیا ہے، بلکہ ایسا واضح خطِ امتیاز کھینچتی ہے جسے ہر شخص روزِ روشن کی طرح دیکھ سکتا ہو۔ تصاویر کے درمیان یہ حد بندی قطعی واضح ہے کہ جانداروں کی تصویریں حرام اور بے جان اشیاء کی تصویریں حلال ہیں۔ اِس خطِ امتیاز میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے جسے احکام کی پیروی کرنی ہو وہ صاف صاف جان سکتا ہے کہ اس کے لیے کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز۔ لیکن اگر جانداروں کی تصاویر میں سے بعض کو جائز اور بعض کو ناجائز ٹھیرایا جاتا تو دونوں قسم کی تصاویر کی کوئی بڑی سے بڑی فہرست

حوض جیسے لگن اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی بھاری دیگیں[۲۱] —— اے آلِ داؤد، عمل کرو شکر کے طریقے پر[۲۲]، میرے بندوں میں کم ہی شکر گزار ہیں۔

بیان کر دینے کے بعد بھی جواز و عدم جواز کی سرحد کبھی واضح نہ ہو سکتی اور بے شمار تصویروں کے بارے میں یہ اشتباہ باقی رہ جاتا کہ انہیں حدِ جواز کے اندر سمجھا جائے یا باہر۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے شراب کے بارے میں اسلام کا یہ حکم کہ اس سے قطعی اجتناب کیا جائے ایک صاف حد قائم کر دیتا ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جاتا کہ اس کی اتنی مقدار استعمال کرنے سے پرہیز کیا جائے جس سے نشہ پیدا ہو، تو حلال اور حرام کے درمیان کسی جگہ بھی حدِ فاصل قائم نہ کی جا سکتی اور کوئی شخص بھی فیصلہ نہ کر سکتا کہ کس حد تک وہ شراب پی سکتا ہے اور کہاں جا کر اسے رک جانا چاہیے۔

۲۱؎ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاں بہت بڑے پیمانے پر مہمان نوازی ہوتی تھی۔ بڑے بڑے حوض جیسے لگن اس لیے بنائے گئے تھے کہ ان میں لوگوں کے لیے کھانا نکال کر رکھا جائے اور بھاری دیگیں اس لیے بنوائی گئی تھیں کہ ان میں بیک وقت ہزاروں آدمیوں کا کھانا پک سکے۔

۲۲؎ یعنی شکر گزار بندوں کی طرح کام کرو۔ جو شخص نعمت دینے والے کا احسان محض زبان سے مانتا ہو، مگر اس کی نعمتوں کو اس کی مرضی کے خلاف استعمال کرتا ہو، اس کا محض زبانی شکر بے معنی ہے۔ اصل شکر گزار بندہ وہی ہے جو زبان سے بھی نعمت کا اعتراف کرے، اور اس کے ساتھ منعم کی عطا کردہ نعمتوں سے وہی کام بھی لے جو مُنعِم کی مرضی کے مطابق ہو۔

(بقیہ اشارات)

جو لوگ قرآن مجید کے مفہوم کو سنّت سے الگ کر کے سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں وہ درحقیقت دین پر ایک بہت بڑا ظلم کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلم قوم کے فکری جہاز بے لنگر ہو جائیں اور پھر باطل نظریات کے تھپیڑے انہیں جس طرح چاہیں بڑی آزادی کے ساتھ بغیر کسی مزاحمت کے ہانک کر لے جائیں۔

اسلام اور عدل اجتماعی

ابوالاعلیٰ مودودی

[یہ وہ مقالہ ہے جو اس سال حج کے موقع پر موتمر عالم اسلامی کے اجتماع منعقدہ مکۂ معظمہ میں پڑھا گیا تھا]

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جس احسنِ تقویم پر پیدا کیا ہے اس کے عجیب کرشموں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عریاں فساد اور بے نقاب فتنے کی طرف کم ہی راغب ہوتا ہے، اور اس بنا پر شیطان اکثر مجبور ہوتا ہے کہ اپنے فتنہ و فساد کو کسی نہ کسی طرح صلاح و خیر کا دھوکا دینے والا لباس پہنا کر اس کے سامنے لائے۔ جنت میں آدم و حوا علیہما السلام کو یہ کہہ کر شیطان ہرگز دھوکا نہ دے سکتا تھا کہ میں تم سے خدا کی نافرمانی کرانا چاہتا ہوں تاکہ تم جنت سے نکال دیئے جاؤ بلکہ اس نے یہ کہہ کر انہیں دھوکا دیا کہ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى۔ یہی انسان کی فطرت آج تک بھی چل رہی ہے اور آج بھی جتنی غلطیوں اور حماقتوں میں شیطان اس کو مبتلا کر رہا ہے وہ سب کسی نہ کسی پُرفریب نعرے اور کسی نہ کسی لباسِ زور کے سہارے مقبول ہو رہی ہیں۔

انہی دھوکوں میں سے ایک بہت بڑا دھوکا وہ ہے جو موجودہ زمانے میں اجتماعی عدل (SOCIAL JUSTICE) کے نام سے بنی نوع انسان کو دیا جا رہا ہے۔ شیطان پہلے ایک مدت تک دنیا کو حریتِ فرد (INDIVIDUAL LIBERTY) اور فراخ دلی (LIBERALISM) کے نام سے دھوکا دیتا رہا اور اس کی بنیاد پر اس نے اٹھارویں صدی میں سرمایہ داری اور لادینی جمہوریت کا ایک نظام قائم کرایا۔ ایک وقت اس نظام کے غلبے کا یہ حال تھا کہ دنیا میں اسے انسانی ترقی کا حرفِ آخر سمجھا جاتا تھا اور ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو

لے کیا میں تمہیں وہ درخت بتاؤں جو حیاتِ ابدی اور لازوال بادشاہی کا درخت ہے؟

ترقی پسند کہلانا چاہتا ہو، مجبور تھا کہ اسی انفرادی آزادی اور فراخ دلی کا نعرہ لگاتے۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ حیاتِ انسانی کے لیے اگر کوئی نظام ہے تو بس یہی سرمایہ داری نظام اور یہی لادینی جمہوریت جو مغرب میں قائم ہے۔ لیکن دیکھتے دیکھتے وہ وقت بھی آگیا جب ساری دنیا یہ محسوس کرنے لگی کہ اس شیطانی نظام نے زمین کو ظلم و جور سے بھر دیا ہے۔ اس کے بعد ابلیس لعین کے لیے ممکن نہ رہا کہ اس نعرے سے مزید کچھ مدت تک نوع انسانی کو دھوکا دے سکے۔ پھر کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ وہی شیطان ایک دوسرا فریب اجتماعی عدل اور اشتراکیت کے نام سے بنا لایا اور اب اس جھوٹ کے لباس میں وہ ایک دوسرا نظام قائم کروا رہا ہے۔ یہ نیا نظام اس وقت تک دنیا کے متعدد ملکوں کو ایک ایسے ظلم عظیم سے لبریز کر چکا ہے جس کی کوئی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں پائی جاتی، مگر اس کے فریب کا یہ زور ہے کہ بہت سے دوسرے ملک اسے ترقی کا حرفِ آخر سمجھ کر قبول کرنے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ ابھی اس فریب کا پردہ پوری طرح چاک نہیں ہوتا ہے۔

مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے پاس خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنّت میں ایک دائمی و ابدی ہدایت موجود ہے جو انہیں شیطانی وساوس پر متنبہ کرنے اور زندگی کے تمام معاملات میں ہدایت کی روشنی دکھانے کے لیے ابد تک کافی ہے، مگر یہ مساکین اپنے دین سے جاہل اور استعمار کی تہذیبی و فکری تاخت سے بُری طرح مغلوب ہیں۔ اس لیے ہر وہ نعرہ جو دنیا کی غالب قوموں کے کیمپ سے بلند ہوتا ہے، اس کی صدائے بازگشت فوراً ہی یہاں سے بلند ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ جس زمانے میں انقلابِ فرانس کے اٹھائے ہوئے افکار کا زور تھا، مسلمان ملکوں میں ہر تعلیم یافتہ آدمی اپنا فرض سمجھتا تھا کہ انہی افکار کا موقع وبے موقع اظہار کرے اور انہی کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالے۔ اس کے بغیر وہ سمجھتا تھا کہ اس کی کوئی عزت قائم نہیں ہو گی اور وہ رجعت پسند سمجھ لیا جائے گا۔ یہ دور جب گزر گیا تو ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی سمتِ قبلہ بھی تبدیل ہونے لگی اور نیا دَور

آئے ہی اجتماعی عدل اور اشتراکیت کے نعرے بلند کرنے والے ہمارے درمیان پیدا ہونے لگے۔ یہاں تک بھی بات قابلِ صبر تھی۔ لیکن غضب یہ ہے کہ ایک گروہ ہمارے اندر ایسا بھی اٹھتا رہا ہے جو اپنے قبلے کی ہر تبدیلی کے ساتھ چاہتا ہے کہ اسلام بھی اپنا قبلہ تبدیل کرے گویا اسلام کے بغیر یہ بیچارے جی نہیں سکتے۔ اس کا ان کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ لیکن ان کی خواہش یہ ہے کہ جس کی پیروی کر کے یہ ترقی کرنا چاہتے ہیں اُسی کی پیروی سے اسلام بھی مشرف ہو جائے اور "دینِ رجعی" ہونے کے الزام سے بچ جائے۔ اسی بنا پر پہلے کوشش کی جاتی تھی کہ حریتِ فرد اور فراخ دلی اور سرمایہ داری اور بے دین جمہوریت کے مغربی تصورات کو عین اسلامی ثابت کیا جائے، اور اسی بنا پر اب یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ اسلام میں بھی اشتراکی تصور کی عدالتِ اجتماعیہ موجود ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کی ذہنی غلامی اور ان کی جاہلیت کی طغیانی ذلت کی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔

میں اس مختصر مقالے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ عدالتِ اجتماعیہ درحقیقت نام کس چیز کا ہے اور اس کے قیام کی صحیح صورت کیا ہے۔ اگرچہ اس امر کی امید بہت کم ہے کہ جو لوگ اشتراکیت کو عدالتِ اجتماعیہ کے قیام کی واحد صورت سمجھ بیٹھے ہیں وہ اپنی غلطی مان لیں گے اور اس سے رجوع کر لیں گے۔ کیونکہ جاہل جب تک محض جاہل رہتا ہے اس کی اصلاح کے بہت کچھ امکانات باقی رہتے ہیں، مگر جب وہ حاکم ہو جاتا ہے تو مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ کا زعم اسے کسی سمجھانے والے کی بات سمجھنے کے قابل نہیں رہنے دیتا۔ لیکن عامۃ الناس خدا کے فضل سے ہر وقت اس قابل رہتے ہیں کہ معقول طریقے سے بات سمجھا کر انہیں شیطان کے فریبوں پر متنبہ کیا جا سکے۔ اور یہی عامۃ الناس ہیں جنہیں فریب و مکر گمراہ اور گمراہ کن لوگ اپنی ضلالتوں کو فروغ دیتے ہیں۔ اس لیے میرے اس مقالے کی غرض دراصل عام لوگوں کے سامنے حقیقت کو کھول کر بیان کر دینا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو میں اپنے مسلمان بھائیوں کو سمجھانا چاہتا ہوں وہ

یہ ہے کہ جو لوگ "اسلام میں بھی عدالت اجتماعیہ موجود ہے" کا نعرہ بلند کرتے ہیں وہ بالکل ایک غلط بات کہتے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ اسلام ہی میں عدالتِ اجتماعیہ ہے۔ اسلام وہ دینِ حق ہے جو خالقِ کائنات اور رب کائنات نے انسان کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا ہے۔ اور انسانوں کے درمیان عدل قائم کرنا اور یہ طے کرنا کہ ان کے لیے کیا چیز عدل ہے اور کیا عدل نہیں ہے، انسانوں کے خالق و رب ہی کا کام ہے۔ دوسرا کوئی نہ اس کا مجاز ہے کہ عدل و ظلم کا معیار تجویز کرے، اور نہ دوسرے کسی میں یہ اہلیت پائی جاتی ہے کہ حقیقی عدل قائم کر سکے۔ انسان اپنا آپ مالک اور حاکم نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے معیارِ عدل خود تجویز کر لینے کا مجاز ہو۔ کائنات میں اس کی حیثیت خدا کے مملوک اور رعیت کی ہے، اس لیے معیارِ عدل تجویز کرنا اس کا اپنا نہیں بلکہ اس کے مالک اور فرمانروا کا کام ہے۔ پھر انسان، خواہ کتنے ہی بلند مرتبے کا ہو، اور خواہ ایک انسان نہیں بہت سے بلند مرتبہ انسان مل کر بھی اپنا ذہن استعمال کر لیں، بہر حال انسانی علم کی محدودیت اور عقل انسانی کی کوتاہی و نارسائی اور انسانی عقل پر خواہشات و تعصبات کی دستبرد سے کسی حال میں بھی مفر نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ انسان خود اپنے لیے کوئی ایسا نظام بنا سکے جو درحقیقت عدل پر مبنی ہو۔ انسان کے بنائے ہوئے نظام میں ابتداءً بظاہر کیسا ہی عدل نظر آئے، بہت جلدی عملی تجربہ یہ ثابت کر دیتا ہے کہ فی الحقیقت اس میں عدل نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ہر انسانی نظام کچھ مدت تک چلنے کے بعد ناقص ثابت ہو جاتا ہے اور انسان اس سے بیزار ہو کر ایک دوسرے احمقانہ تجربے کی طرف پیش قدمی کرنے لگتا ہے۔ حقیقی عدل صرف اسی نظام میں ہو سکتا ہے جو ایک عالم الغیب والشہادہ اور سبوح و قدوس ہستی نے بنایا ہو۔

دوسری بات جو آغاز ہی میں سمجھ لینی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص "اسلام میں عدل ہے" کہتا ہے وہ حقیقت سے کمتر بات کہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عدل ہی اسلام کا مقصود ہے اور اسلام آیا ہی اس لیے ہے کہ عدل قائم کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَقَدْ

اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۔ (الحدید-۲۵)

یہ وہ باتیں ہیں جن سے اگر ایک مسلمان غافل نہ ہو تو وہ کبھی عدالتِ اجتماعیہ کی تلاش میں اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ کر کسی دوسرے ماخذ کی طرف توجہ کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ جس لمحے اسے عدل کی ضرورت کا احساس ہوگا اسی لمحے اسے معلوم ہو جائے گا کہ عدل اللہ اور اس کے رسولؐ کے سوا کسی کے پاس نہ ہے، اور نہ ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ بھی جان لیگا کہ عدل قائم کرنے کے لیے اس کے سوا کچھ کرنا نہیں ہے کہ اسلام، پورا کا پورا اسلام، بلاکم وکاست اسلام قائم کر دیا جائے۔ عدل اسلام سے الگ کسی چیز کا نام نہیں ہے۔ اسلام خود عدل ہے۔ اس کا قائم ہونا اور عدل کا قائم ہو جانا ایک ہی چیز ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ عدلِ اجتماعی درحقیقت ہے کس چیز کا نام اور اس کے قیام کی صحیح صورت کیا ہے؟

ہر انسانی معاشرہ ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں افراد سے مل کر بنتا ہے۔ اس مرکب کا ہر فرد ذی روح، ذی عقل اور ذی شعور ہے۔ ہر فرد اپنی ایک مستقل شخصیت رکھتا ہے جسے پھلنے پھولنے اور نشو ونما پانے کے لیے مواقع درکار ہیں۔ ہر فرد کا اپنا ایک ذاتی ذوق ہے۔ اس کے اپنے نفس کی کچھ رغبات وخواہشات ہیں۔ اس کے اپنے جسم وروح کی کچھ ضروریات ہیں۔ ان افراد کی حیثیت کسی مشین کے بے روح پرزوں کی سی نہیں ہے کہ اصل چیز مشین ہو اور یہ پُرزے اس مشین ہی کے لیے مطلوب ہوں، اور بجائے خود پرزوں کی کوئی شخصیت نہ ہو۔ بلکہ اس کے برعکس انسانی معاشرہ جیتے جاگتے انسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ افراد اس مجموعے کے لیے نہیں ہیں بلکہ مجموعہ ان افراد کے لیے ہے، اور افراد جمع ہو کر یہ مجموعہ بناتے ہی اس غرض کے لیے ہیں کہ ایک دوسرے کی مدد سے انہیں اپنی ضروریات حاصل کرنے اور اپنے نفس وجسم کے مطالبات اور تقاضے پورے

کرنے کے مواقع ملیں۔ پھر یہ تمام افراد فرداً فرداً خدا کے سامنے جوابدہ ہیں۔ ہر ایک کو اس دنیا میں ایک خاص مدتِ امتحان (جو ہر فرد کے لیے الگ مقرر ہے) گزارنے کے بعد اپنے خدا کے حضور جاکر حساب دینا ہے کہ جو قوتیں اور صلاحیتیں اسے دنیا میں دی گئی تھیں ان سے کام لیکر اور جو ذرائع اسے عطا کیے گئے تھے ان پر کام کر کے وہ اپنی کیا شخصیت بنا کر لایا ہے۔ خدا کے سامنے انسان کی یہ جوابدہی اجتماعی نہیں بلکہ انفرادی ہے۔ وہاں کنبے اور قبیلے اور قومیں کھڑی ہو کر حساب نہیں دینگی، بلکہ دنیا کے تمام رشتوں سے کاٹ کر اللہ تعالیٰ ہر ہر انسان کو الگ الگ اپنی عدالت میں حاضر کرے گا اور فرداً فرداً اس سے پوچھے گا کہ تو کیا کر کے آیا ہے اور کیا بن کر آیا ہے۔

یہ دونوں امور ـــــ یعنی دنیا میں انسانی شخصیت کا نشو و نما، اور آخرت میں انسان کی جواب دہی ـــــ اسی بات کے طالب ہیں کہ دنیا میں فرد کو حریت حاصل ہو۔ اگر کسی معاشرے میں فرد کو اپنی پسند کے مطابق اپنی شخصیت کی تکمیل کے مواقع حاصل نہ ہوں تو اس کے اندر انسانیت ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے، اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، اس کی قوتیں اور قابلیتیں دب کر رہ جاتی ہیں اور اپنے آپ کو محصور و محبوس پا کر انسان جمود و تعطّل کا شکار ہو جاتا ہے۔ پھر آخرت میں ان محبوس و محصور افراد کے قصوروں کی بیشتر ذمہ داریاں اُن لوگوں کی طرف منتقل ہو جانے والی ہیں جو اس قسم کے اجتماعی نظام کو بنانے اور چلانے کے ذمہ دار ہوں۔ ان سے صرف ان کے انفرادی اعمال ہی کا محاسبہ نہ ہو گا بلکہ اس بات کا محاسبہ بھی ہو گا کہ انہوں نے ایک جابرانہ نظام قائم کر کے دوسرے بے شمار انسانوں کو ان کی مرضی کے خلاف اور اپنی مرضی کے مطابق ناقص شخصیتیں بننے پر مجبور کیا۔ ظاہر ہے کہ کوئی مومن بالآخرت یہ بھاری بوجھ اٹھا کر خدا کے سامنے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ اگر خدا سے ڈرنے والا انسان ہے تو لازماً وہ افراد کو زیادہ سے زیادہ حریت دینے کی طرف مائل ہو گا تاکہ ہر فرد جو کچھ بھی بنے اپنی ذمہ داری پر بنے، اس کے غلط شخصیت بننے کی ذمہ داری اجتماعی نظام چلانے والے پر عائد نہ ہو جائے۔

یہ معاملہ تو ہے انفرادی آزادی کا۔ دوسری طرف معاشرے کو دیکھیے جو کنبوں، قبیلوں، قوموں اور پوری انسانیت کی شکل میں علی الترتیب قائم ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا ایک مرد اور ایک عورت اور ان کی اولاد سے ہوتی ہے جس سے خاندان بنتا ہے۔ ان خاندانوں سے قبیلے اور برادریاں بنتی ہیں، ان سے ایک قوم وجود میں آتی ہے، اور قوم اپنے اجتماعی ارادوں کی تنفیذ کے لیے ایک ریاست کا نظام بناتی ہے۔ ان مختلف شکلوں میں یہ اجتماعی ادارے اصلاً جس غرض کے لیے مطلوب ہیں وہ یہ ہے کہ ان کی حفاظت اور ان کی مدد سے فرد کو اپنی شخصیت کی تکمیل کے وہ مواقع نصیب ہو سکیں جو وہ تنہا اپنے بل بوتے پر حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن اس بنیادی مقصد کا حصول اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ان میں سے ہر ایک ادارے کو افراد پر، اور بڑے اداروں کو چھوٹے اداروں پر اقتدار حاصل ہو تاکہ وہ افراد کی ایسی آزادی کو روک سکیں جو دوسروں پر دست درازی کی حد تک پہنچتی ہو، اور افراد سے وہ خدمت لے سکیں جو بحیثیت مجموعی تمام افرادِ معاشرہ کی فلاح و ترقی کے لیے مطلوب ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر عدالتِ اجتماعیہ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور انفرادیت و اجتماعیت کے متضاد تقاضے ایک گتھی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک طرف انسانی فلاح اس بات کی مقتضی ہے کہ فرد کو معاشرے میں آزادی حاصل ہو تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں اور اپنی پسند کے مطابق اپنی شخصیت کی تکمیل کر سکے۔ اور اسی طرح خاندان، قبیلے، برادریاں، اور مختلف گروہ بھی اپنے سے بڑے دائرے کے اندر اُس آزادی سے متمتع ہوں جو ان کے اپنے دائرۂ عمل میں انہیں حاصل ہونی ضروری ہے۔ مگر دوسری طرف انسانی فلاح ہی اس بات کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ افراد پر خاندان کا، خاندانوں پر قبیلوں اور برادریوں کا، اور تمام افراد اور چھوٹے اداروں پر ریاست کا اقتدار ہو، تاکہ کوئی اپنی حد سے تجاوز کر کے دوسروں پر ظلم و تعدی نہ کر سکے۔ اور یہی مسئلہ آگے چل کر پوری انسانیت کے لیے بھی پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف ہر قوم اور ریاست کی آزادی و خود مختاری کا برقرار رہنا بھی ضروری ہے، اور دوسری طرف کسی بالاتر ضابطہ قوت کا ہونا بھی ضروری

ہے کہ یہ قومیں اور ریاستیں حد سے تجاوز نہ کر سکیں۔

اب عدالتِ اجتماعیہ درحقیقت جس چیز کا نام ہے وہ یہ ہے کہ افراد، خاندانوں، قبیلوں، برادریوں اور قوموں میں سے ہر ایک کو مناسب آزادی بھی حاصل ہو اور اس کے ساتھ ظلم و عدوان کو روکنے کے لیے مختلف اجتماعی اداروں کو افراد پر اور ایک دوسرے پر اقتدار بھی حاصل رہے تاکہ مختلف افراد و مجتمعات سے وہ خدمت بھی لی جاسکے جو اجتماعی فلاح کے لیے درکار ہے۔

اس حقیقت کو جو شخص اچھی طرح سمجھ لیگا وہ پہلی ہی نظر میں یہ جان لیگا کہ جس طرح حریتِ فرد، فراخ دلی، سرمایہ داری اور بے دین جمہوریت کا وہ نظامِ اجتماعی عدل کے منافی تھا جو انقلابِ فرانس کے نتیجے میں قائم ہوا تھا، ٹھیک اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ وہ اشتراکیت بھی اس کے قطعی منافی ہے جو کارل مارکس اور اینگلز کے نظریات کی پیروی میں اختیار کی جارہی ہے۔ پہلے نظام کا قصور یہ تھا کہ اس نے فرد کو حدِ مناسب سے زیادہ آزادی دے کر خاندان، قبیلے، برادری، معاشرے اور قوم پر تعدی کرنے کی کھلی چھوٹ دیدی اور اس سے اجتماعی فلاح کی خدمت لینے کے لیے معاشرے کی قوتِ ضابطہ کو بہت ڈھیلا کر دیا۔ اور اِس دوسرے نظام کا قصور یہ ہے کہ یہ ریاست کو حد سے زیادہ طاقتور بنا کر افراد، خاندانوں، قبیلوں اور برادریوں کی آزادی قریب قریب بالکل سلب کر لیتا ہے، اور افراد سے مجتمع کی خدمت لینے کے لیے ریاست کو اتنا زیادہ اقتدار دے دیتا ہے کہ افراد ذی روح انسانوں کے بجائے ایک مشین کے بے روح پرزوں کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ بالکل جھوٹ کہتا ہے جو کہتا ہے کہ اس طریقے سے عدالتِ اجتماعیہ قائم ہو سکتی ہے۔ درحقیقت یہ ظلمِ اجتماعی کی وہ بدترین صورت ہے جو کبھی کسی نمرود، کسی فرعون اور کسی چنگیز خاں کے دَور میں بھی نہ رہی تھی۔ آخر اس چیز کو کون صاحبِ عقل اجتماعی عدل سے تعبیر کر سکتا ہے کہ ایک شخص یا چند اشخاص بیٹھ کر اپنا ایک اجتماعی فلسفہ تصنیف کر لیں، پھر حکومت کے غیر محدود اختیارات سے کام لیکر اس فلسفے کو زبردستی ایک پورے ملک کے رہنے والے

کروڑوں افراد پر زبردستی مسلط کردیں۔ لوگوں کے اموال ضبط کریں، زمینوں پر قبضہ کریں۔ کارخانوں کو قومی ملکیت بنائیں، اور پورے ملک کو ایک ایسے جیل خانے میں تبدیل کردیں جس میں تنقید، فریاد، شکایت، استغاثے اور عدالتی انصاف کا ہر دروازہ لوگوں کے لیے مسدود ہو۔ ملک کے اندر کوئی جماعت نہ ہو، کوئی تنظیم نہ ہو، کوئی پلیٹ فارم نہ ہو جس پر لوگ زبان کھول سکیں، کوئی پریس نہ ہو جس میں لوگ اظہارِ خیال کرسکیں، اور کوئی عدالت نہ ہو جس کا دروازہ انصاف کے لیے کھٹکھٹا سکیں۔ جاسوسی کا نظام اتنے بڑے پیمانے پر پھیلا دیا جائے کہ ہر ایک آدمی دوسرے آدمی سے ڈرنے لگے کہ کہیں یہ جاسوس نہ ہو، حتیٰ کہ اپنے گھر میں بھی ایک آدمی زبان کھولتے ہوئے پہلے چاروں طرف دیکھ لے کہ کوئی کان اس کی بات سننے اور کوئی زبان اسے حکومت تک پہنچانے کے لیے کہیں پاس ہی موجود نہ ہو۔ پھر جمہوریت کا فریب دینے کے لیے انتخابات کراتے جائیں، مگر پوری کوشش کی جائے کہ اس فلسفے کے تصنیف کرنے والوں سے اختلاف رکھنے والا کوئی شخص ان انتخابات میں حصہ نہ لے سکے، اور نہ کوئی ایسا شخص ان میں دخیل ہوسکے جو خود اپنی کوئی رائے بھی رکھتا ہو اور اپنا ضمیر فروخت کرنے والا بھی نہ ہو۔

بالفرض اس طریقے سے اگر معاشی دولت کی مساوی تقسیم ہو بھی سکے ___ درآنحالیکہ آج تک کوئی اشتراکی نظام ایسا نہیں کرسکا ہے ___ تب بھی کیا عدل محض معاشی مساوات کا نام ہے؟ میں یہ سوال نہیں کرتا کہ اس نظام کے حاکموں اور محکوموں کے درمیان بھی معاشی مساوات ہے یا نہیں؟ میں یہ نہیں پوچھتا کہ اس نظام کا ڈکٹیٹر اور اس کے اندر رہنے والا ایک کسان کیا اپنے معیارِ زندگی میں مساوی ہیں؟ میں صرف یہ پوچھتا ہوں کہ اگر ان سب کے درمیان واقعی پوری معاشی مساوات قائم بھی ہو جاتے تو کیا اس کا نام اجتماعی عدل ہوگا؟ کیا عدل یہی ہے کہ ڈکٹیٹر اور اس کے ساتھیوں نے جو فلسفہ گھڑا ہے اس کو وہ پولیس اور فوج اور جاسوسی نظام کی طاقت سے بالجبر ساری قوم پر مسلط کر دینے میں بھی آزاد ہو، اور قوم کا کوئی فرد اس کے فلسفے پر، یا

اس کی تنفیذ کے کسی چھوٹے سے چھوٹے جزوی عمل پر محض زبان سے ایک لفظ نکالنے تک میں آزاد نہ ہو؟ کیا یہ عدل ہے کہ ڈکٹیٹر اور اس کے چند مٹھی بھر حامی اپنے فلسفے کی ترویج کے لیے تمام ملک کے ذرائع و وسائل استعمال کرنے اور ہر قسم کی تنظیمات بنانے کے حقدار ہوں مگر ان سے مختلف رائے رکھنے والے دو آدمی بھی مل کر کوئی تنظیم نہ کر سکیں، کسی مجمع کو خطاب نہ کر سکیں، اور کسی پریس میں ایک لفظ بھی شائع نہ کرا سکیں؟ کیا یہ عدل ہے کہ تمام زمینداروں اور کارخانہ داروں کو بیدخل کر کے پورے ملک میں صرف ایک ہی زمیندار اور کارخانہ دار رہ جائے جس کا نام حکومت ہو، اور وہ حکومت چند گنے چنے آدمیوں کے ہاتھ میں ہو، اور وہ آدمی ایسی تمام تدابیر اختیار کر لیں جن سے پوری قوم بالکل بے بس ہو جائے اور حکومت کے اختیارات کا ان کے ہاتھ سے نکل کر دوسروں کے ہاتھوں میں چلا جانا قطعی ناممکن ہو جائے؟ انسان اگر محض پیٹ کا نام نہیں ہے، اور انسانی زندگی اگر صرف معاش تک محدود نہیں ہے، تو محض معاشی مساوات کو عدل کیسے کہا جا سکتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ظلم و جور قائم کر کے، اور انسانیت کے ہر رُخ کو دبا کر صرف معاشی دولت کی تقسیم میں لوگوں کو برابر بھی کر دیا جائے، اور خود ڈکٹیٹر اور اس کے اذناب بھی اپنے معیارِ زندگی میں لوگوں کے برابر ہو کر رہیں، تب بھی اس ظلمِ عظیم کے ذریعہ سے یہ مساوات قائم کرنا اجتماعی عدل قرار نہیں پا سکتا بلکہ یہ، جیسا کہ ابھی میں آپ سے عرض کر چکا ہوں، وہ بدترین اجتماعی ظلم ہے جس سے تاریخِ انسانی کبھی اس سے پہلے آشنا نہ ہوئی تھی۔

اب میں اختصار کے ساتھ آپ کو بتاؤں گا کہ اسلام جس عدل کا نام ہے وہ کیا ہے۔ اسلام میں اس امر کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی شخص، یا انسانوں کا کوئی گروہ انسانی زندگی میں عدل کا کوئی فلسفہ اور اس کے قیام کا کوئی طریقہ بیٹھ کر خود گھڑے اور اسے بالجبر لوگوں پر مسلط کرے اور کسی بولنے والی زبان کو حرکت نہ کرنے دے۔ یہ مقام ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کو تو کیا، خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حاصل نہ تھا۔ اسلام میں کسی ڈکٹیٹر کے لیے کوئی

جگہ نہیں ہے۔ صرف خدا ہی کا یہ مقام ہے کہ انسان اس کے حکم کے آگے بے چون و چرا سر جھکا دیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اس کے حکم کے تابع تھے اور ان کے حکم کی اطاعت صرف اس لیے فرض تھی کہ وہ خدا کی طرف سے حکم دیتے تھے نہ کہ معاذ اللہ اپنے نفس سے گھڑ کر کوئی فلسفہ لے آتے تھے۔ رسول اور خلفائے رسول کے نظام حکم میں صرف شریعت الٰہیہ تنقید سے بالاتر تھی۔ اس کے بعد ہر شخص کو ہر وقت ہر معاملے میں زبان کھولنے کا پورا حق حاصل تھا۔

اسلام میں اللہ تعالیٰ نے خود وہ حدود قائم کر دیئے ہیں جن میں افراد کی آزادی کو محدود ہونا چاہیے۔ اس نے خود متعین کر دیا ہے کہ ایک فرد مسلم کے لیے کون کون سے افعال حرام ہیں جن سے اس کو بچنا چاہیے اور کیا کچھ اس پر فرض ہے جسے اس کو ادا کرنا چاہیے۔ کیا حقوق اس کے دوسروں پر ہیں اور کیا حقوق دوسروں کے اس پر ہیں۔ کن ذرائع سے ایک مال کی ملکیت کا اس کی طرف منتقل ہونا جائز ہے اور کون سے ذرائع ایسے ہیں جن سے حاصل ہونے والے مال کی ملکیت جائز نہیں ہے۔ افراد کی بھلائی کے لیے مجتمع پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں اور مجتمع کی بھلائی کے لیے افراد پر، خاندانوں اور برادریوں پر اور پوری قوم پر کیا پابندیاں عائد کی جاسکتی ہیں اور کیا خدمات لازم کی جاسکتی ہیں۔ یہ تمام امور کتاب و سنت کے اس مستقل دستور میں ثبت ہیں جس پر کوئی نظر ثانی کرنے والا نہیں ہے اور جس میں کسی کو کمی و بیشی کر دینے کا حق نہیں ہے۔ اس دستور کی رو سے ایک شخص کی انفرادی آزادیوں پر جو پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں اُن سے تجاوز کرنے کا تو وہ حق نہیں رکھتا، لیکن ان حدود کے اندر جو آزادی اس کو حاصل ہے اسے سلب کر لینے کا بھی کسی کو حق نہیں ہے۔ کسبِ اموال کے جن ذرائع اور صَرفِ مال کے جن طریقوں کو حرام کر دیا گیا ہے ان کے وہ قریب نہیں پھٹک سکتا اور پھٹکے تو اسلامی قانون اسے مستوجبِ سزا سمجھتا ہے، لیکن جو ذرائع حلال ٹھیرائے گئے ہیں ان سے حاصل ہونے والی ملکیت پر اس کے حقوق بالکل محفوظ ہیں اور اس میں تصرف کے جو طریقے جائز کیے گئے ہیں ان سے کوئی اس کو محروم نہیں کر سکتا۔ اسی طرح مجتمع کی فلاح کے لیے جو فرائض

افراد پر عائد کر دیئے گئے ہیں ان کے ادا کرنے پر تو وہ مجبور ہے، لیکن اس سے زائد کوئی بار جبراً اس پر عائد نہیں کیا جا سکتا الّا یہ کہ وہ خود رضا کارانہ ایسا کرے۔ اور یہی حال مجتمع اور ریاست کا بھی ہے کہ افراد کے جو حقوق اس پر عائد کیے گئے ہیں انہیں ادا کرنا اس پر اتنا ہی لازم ہے جتنا افراد سے اپنے حقوق وصول کرنے کے اسے اختیارات ہیں۔ اس مستقل دستور کو اگر عملاً نافذ کر دیا جائے تو ایسا مکمل عدلِ اجتماعی قائم ہوتا ہے جس کے بعد کوئی شئے مطلوب باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ دستور جب تک موجود ہے اس وقت تک کوئی شخص خواہ کتنی ہی کوشش کرے، مسلمانوں کو ہرگز اس دھوکے میں نہیں ڈال سکتا کہ جو اشتراکیت اس نے کسی جگہ سے مستعار لے لی ہے وہی عین اسلام ہے۔

اسلام کے اس دستور میں فرد اور مجتمع کے درمیان ایسا توازن قائم کیا گیا ہے کہ نہ فرد کو وہ آزادی دی گئی ہے جس سے وہ مجتمع کے مفاد کو نقصان پہنچا سکے، اور نہ مجتمع کو یہ اختیارات دیئے گئے ہیں کہ وہ فرد سے اس کی وہ آزادی سلب کر سکے جو اس کی شخصیت کے نشو و نما کے لیے ضروری ہے۔ اسلام ایک فرد کی طرف دولت کے انتقال کی صرف تین صورتیں معین کر دیتا ہے۔ ایک وراثت، دوسرے ہبہ، تیسرے کسب۔ وراثت صرف وہ معتبر ہے جو کسی مال کے جائز مالک سے اس کے وارث کو شرعی قاعدے کے مطابق پہنچے۔ ہبہ یا عطیہ صرف وہ معتبر ہے جو کسی مال کے جائز مالک نے شرعی حدود کے اندر دیا ہو، اور اگر یہ عطیہ کسی حکومت کی طرف سے ہو تو وہ اسی صورت میں جائز ہے جبکہ وہ کسی صحیح خدمت کے صلے میں یا مجتمع کے مفاد کے لیے املاکِ حکومت میں سے معروف طریقے پر دیا گیا ہو، نیز اس طرح کا عطیہ دینے کی حقدار بھی وہ حکومت ہے جو شرعی دستور کے مطابق شوریٰ کے طریقے پر چلائی جا رہی ہو اور جس سے محاسبہ کرنے کی قوم کو آزادی حاصل ہو۔ رہا کسب تو صرف وہ کسب جائز ہے جو کسی حرام طریقے سے نہ ہو۔ سرقہ، غصب، ناپ تول میں کمی بیشی، خیانت، رشوت، غبن، تجہ گری، احتکار، سود، جُوا، دھوکے کا سودا، مسکرات کی صنعت و تجارت، اور اشاعت فاحشہ کرنے والے کاروبار کے ذریعہ سے کسب اسلام میں حرام ہے۔ اِن حدود کے اندر جو دولت بھی کسی کو ملے وہ اس کی

جائز ملک ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ کم ہو یا زیادہ ایسی ملکیت کے لیے نہ کمی کی کوئی حد مقرر کی جا سکتی ہے نہ زیادتی کی۔ نہ اس کا کم ہونا اس بات کو جائز کر دیتا ہے کہ دوسروں سے چھین کر اس میں اضافہ کیا جائے۔ اور نہ اس کا زیادہ ہونا اس امر کے لیے کوئی دلیل ہے کہ اسے زبردستی کم کیا جائے۔ البتہ جو دولت ان جائز حدود سے تجاوز کر کے حاصل ہوئی ہو اس کے بارے میں یہ سوال اٹھانے کا مسلمانوں کو حق پہنچتا ہے کہ مِنْ اَیْنَ لَکَ ھٰذَا (یہ تجھے کہاں سے ملا)۔ اس دولت کے بارے میں پہلے قانونی تحقیق ہونی چاہیے، پھر اگر ثابت ہو جائے کہ وہ جائز ذرائع سے حاصل نہیں ہوتی ہے تو اسے ضبط کرنے کا اسلامی حکومت کو پورا حق پہنچتا ہے۔

جائز طریقے پر حاصل ہونے والی دولت پر تصرف کے بارے میں بھی فرد کو بالکل کھلی چھوٹ نہیں دے دی گئی ہے بلکہ اس پر کچھ قانونی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں تاکہ کوئی فرد اپنی ملکیت میں کسی ایسے طریقے پر تصرف نہ کر سکے جو معاشرے کے لیے نقصان دہ ہو، یا جس میں خود اس فرد کے دین و اخلاق کا نقصان ہو۔ اسلام میں کوئی شخص اپنی دولت کو فسق و فجور میں صرف نہیں کر سکتا۔ شراب نوشی اور قمار بازی کا دروازہ اس کے لیے بند ہے زنا کا دروازہ بھی اس کے لیے بند ہے۔ وہ آزاد انسانوں کو پکڑ کر انہیں لونڈی غلام بنانے اور ان کی بیع و شریٰ کرنے کا بھی کسی کو حق نہیں دیتا کہ دولت مند لوگ اپنے گھروں کو خریدی ہوئی لونڈیوں سے بھر لیں۔ اِسراف اور حد سے زیادہ ترفہ اور تنعّم پر بھی وہ حدود عائد کرتا ہے۔ اور وہ اسے بھی جائز نہیں رکھتا کہ تم خود عیش کرو اور تمہارا ہمسایہ رات کو بھوکا سوئے۔ اسلام صرف مشروع اور معروف طریقے پر ہی دولت سے متمتع ہونے کا آدمی کو حق دیتا ہے۔ اور اگر ضرورت سے زائد دولت کو مزید دولت کمانے کے لیے کوئی شخص استعمال کرنا چاہے تو وہ کسبِ مال کے صرف حلال طریقے ہی اختیار کر سکتا ہے۔ اُن حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا جو شریعت نے کسب پر عائد کر دی ہیں۔

پھر اسلام معاشرے کی خدمت کے لیے ہر اُس فرد پر جس کے پاس نصاب سے زائد

مال جمع ہو زکوٰۃ عائد کرتا ہے۔ نیز وہ اموالِ تجارت پر، زمین کی پیداوار پر، مواشی پر، اور بعض دوسرے اموال پر بھی ایک خاص شرح سے زکوٰۃ مقرر کرتا ہے۔ آپ دنیا کے کسی ملک کو لے لیجیے اور حساب لگا کر دیکھ لیجیے کہ اگر شرعی طریقے کے مطابق وہاں باقاعدہ زکوٰۃ وصول کی جائے اور اسے قرآن کے مقرر کیے ہوئے مصارف میں باقاعدہ تقسیم کیا جائے تو کیا چند سال کے اندر وہاں ایک شخص بھی حاجاتِ زندگی سے محروم رہ سکتا ہے؟

اس کے بعد جو دولت کسی ایک فرد کے پاس مرتکز ہو گئی ہو، اسلام اس کے مرتے ہی اس دولت کو وراثت میں تقسیم کر دیتا ہے تاکہ یہ ارتکاز ایک دائمی اور مستقل ارتکاز بن کر نہ رہ جائے۔

اس کے علاوہ اسلام اگرچہ اس کو پسند کرتا ہے کہ مالک، زمین اور مزارع، یا کارخانہ دار اور مزدور کے درمیان خود باہمی رضامندی سے معروف طریقے پر معاملات طے ہوں، اور قانون کی مداخلت کی ضرورت نہ پیش آئے۔ لیکن جہاں کہیں ان معاملات میں ظلم ہو رہا ہو وہاں اسلامی حکومت مداخلت کرنے کا پورا حق رکھتی ہے اور قانون کے ذریعہ سے انصاف کے حدود قائم کر سکتی ہے۔

اسلام اس امر کو حرام نہیں کرتا کہ کسی صنعت یا کسی تجارت کو حکومت اپنے انتظام میں چلائے۔ اگر کوئی صنعت یا تجارت ایسی ہو جس کی اجتماعی مصالح کے لیے ضرورت تو ہو مگر افراد اس کو چلانے کے لیے تیار نہ ہوں، یا افراد کے انتظام میں اس کا چلنا اجتماعی مفاد کے خلاف ہو تو اسے حکومت کے انتظام میں چلایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی صنعت یا تجارت کچھ افراد کے ہاتھوں میں ایسے طریقوں سے چل رہی ہو جو اجتماعی مفاد کے لیے نقصان دہ ہو تو حکومت ان افراد کو معاوضہ دیکر وہ کاروبار اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے اور کسی دوسرے مناسب طریقے سے اس کے چلانے کا انتظام کر سکتی ہے۔ ان تدابیر کے اختیار کرنے میں کوئی مانع شرعی نہیں ہے۔ لیکن اسلام اس بات کو ایک اصول کی حیثیت سے قبول نہیں کرتا کہ دولت کی پیداوار کے تمام ذرائع حکومت کی ملک میں ہوں اور حکومت ہی ملک کی واحد صناع و تاجر اور مالک اراضی ہو۔

بیت المال کے بارے میں اسلام کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ وہ اللہ اور مسلمانوں کا مال ہے اور کسی شخص کو اس پر مالکانہ تصرّف کا حق نہیں ہے۔ مسلمانوں کے تمام امور کی طرح بیت المال کا انتظام بھی قوم یا اس کے آزاد نمائندوں کے مشورے سے ہونا چاہیے۔ جس شخص سے بھی کچھ لیا جائے، اور جس مصرف میں بھی مال صرف کیا جائے وہ جائز شرعی طریقے پر ہونا چاہیے اور مسلمانوں کو اس پر محاسبے کا پورا حق ہے۔

اس کلام کو ختم کرتے ہوئے میں ہر سوچنے والے انسان سے یہ سوال کرتا ہوں کہ اگر عدالتِ اجتماعیہ صرف معاشی عدل ہی کا نام ہے تو کیا یہ معاشی عدل جو اسلام قائم کرتا ہے، ہمارے لیے کافی نہیں ہے؟ کیا اس کے بعد کوئی ضرورت ایسی باقی رہ جاتی ہے جس کی خاطر تمام افراد کی آزادیاں سلب کرنا، لوگوں کے اموال ضبط کرنا، اور ایک پوری قوم کو چند آدمیوں کا غلام بنا دینا ہی ناگزیر ہو؟ آخر اس امر میں کیا چیز مانع ہے کہ ہم مسلمان اپنے ملکوں میں اسلامی دستور کے مطابق خالص شرعی حکومتیں قائم کریں اور ان میں خدا کی پوری شریعت کو بلاکم و کاست نافذ کر دیں۔ جس روز بھی ہم ایسا کریں گے، صرف یہی نہیں کہ ہمیں اشتراکیت سے کسبِ فیض کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے گی، بلکہ خود اشتراکیت زدہ ممالک کے لوگ ہمارے نظامِ زندگی کو دیکھ کر یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ جس روشنی کے بغیر وہ تاریکی میں بھٹک رہے تھے وہ ان کی آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔

رسائل و مسائل

چند فقہی سوالات

سوال :- چند حل طلب مسائل پیش خدمت ہیں۔ امید ہے کہ ان میں آپ صحیح رہنمائی کریں گے۔

(۱) اب تک تجارتی حصص پر زکوٰۃ کے متعلق آپ کی جو تحریریں میری نظر سے گزری ہیں ان میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ اسلامی ریاست یا کم از کم تحصیلِ زکوٰۃ کا ایک مرکزی نظام موجود ہے۔ اور مسئلہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کس مرحلہ پر اور کس سے وصول کی جائے گی۔ جب تک کوئی مرکزی نظمِ زکوٰۃ قائم نہ ہو اس وقت تک حصص پر زکوٰۃ کی کیا صورت ہو گی؟ اس وقت بہت سے لوگوں کے پاس تجارتی حصے ہیں۔ وہ ان پر کس شرح سے زکوٰۃ ادا کریں؟

میں نے اپنے حصص کو روپے کا نعم البدل قیاس کرتے ہوئے ان کی مالیت پر ۲½ فی صد نکالنا چاہا تھا لیکن حصص کی سالانہ آمدنی ٹیکس کٹ کٹا کر جتنی ملتی ہے وہ پوری ان کی زکوٰۃ میں چلی جاتی ہے۔ بعض حصص سے آمدنی اتنی کم ہوتی ہے کہ اُلٹا جیب سے زکوٰۃ ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ صورت قطعاً غیر تشفی بخش ہے۔

(۲) ترجمان، جلد ۵۰ عدد ۱ میں قطبین میں اوقات سحر و افطار پر ڈاکٹر حمید اللہ کا مضمون شائع کیا گیا ہے۔ اسی بحث کو زیادہ تفصیل سے ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب انٹروڈکشن ٹو اسلام میں پیش کیا ہے۔ پہلی دفعہ میں نے سرسری نظر سے مضمون دیکھا تو اچھا لگا۔ لیکن دوبارہ غور سے پڑھنے پر سخت قابلِ اعتراض محسوس ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کا استدلال یہ ہے کہ خطِ استوا سے قطبین کی طرف جائیں تو دن اور رات کا تفاوت بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ۴۵ درجے عرض البلد تک تو یہ تفاوت قابلِ برداشت ہوتا ہے لیکن اس سے آگے نہیں" لہٰذا اس عرض البلد سے آگے تمام مسلمان ۴۵ کے اوقاتِ طلوع و غروب کے مطابق نماز روزے کا اہتمام کریں۔

اگر اس تجویز کو مان لیا جائے تو کینیڈا، امریکہ کے شمالی حصے، سارے یورپ، ماسوا اسپین اور اٹلی کے، نیز تقریباً پورے روس کے مسلمانوں کو اپنے مقام کے طلوع و غروب کے حساب سے ارکانِ دین ادا کرنے کے بجائے گھڑی کے حساب سے سارے کام کرنے چاہییں۔ میری اطلاع ہے کہ پیرس مسجد کی اقتدا میں پیرس کے مسلمان رمضان میں یہی کرتے ہیں۔ وہ ریڈیو مراکش لگائے رکھتے ہیں اور جیسے ہی مراکش میں افطار کی اذان ہوتی ہے وہ افطار کر لیتے ہیں۔ چاہے سورج سر پر کھڑا ہو کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

میں نے لندن کا سب سے طویل روزہ دیکھا ہے۔ سحر سے افطار تک تقریباً ۱۸ گھنٹے بنتے تھے۔ لیکن پنجاب کے تیرہ چودہ گھنٹے کے روزے زیادہ مشکل معلوم ہوتے ہیں اتنے طویل روزہ کے باوجود افطار کے وقت پیاس بالکل نہ ہوتی تھی۔ بھوک ضرور لگتی تھی۔ لیکن اس سے طبیعت اتنی نڈھال نہ ہوتی تھی جتنی اپنے ہاں ہوتی ہے۔ آخر یورپ کے مسلمانوں کے لیے کیونکر جائز ہے کہ وہ مقامی طلوع و غروب کو نظر انداز کر کے مراکش کی پیروی کریں؟

میرے ایک شناسا نے ڈاکٹر حمید اللہ سے لکھ کر پوچھا تھا کہ ۴۵ عرض البلد انہوں نے کیونکر تجویز کیا۔ جواب ملا کہ صحابہ یہیں تک گئے تھے۔ اس لیے اسے حد کے طور پر لیا ہے۔

اس مسئلہ پر آپ کی کیا رائے ہے؟ رسائل و مسائل میں آپ کے جواب نظر سے گزرے ہیں لیکن وہ بہت عمومی قسم کے ہیں۔ یہاں ڈاکٹر صاحب نے اتنی تفصیل میں جا کر

معمولی اور غیر معمولی منطقوں کی حدود کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ لندن میں یہ سوال اس لیے اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ یورپین نومسلم سورج کے بجائے گھڑی کے مطابق عبادات قائم کرنا چاہتے ہیں بلکہ ان کا بس چلے تو جمعہ کی نماز اتوار کو کریں ـــ یہ تجویز کئی دفعہ میرے سامنے آئی ہے۔

(۳) یہاں لندن میں ایک مسلمان طالب علم ایک جرمن لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ وہ مسلمان بننے پر آمادہ نہ ہوئی۔ لہٰذا میں نے شادی رکوانے کی کوشش کی۔ صاحبزادے کو سمجھایا کہ وہ کیونکر برداشت کریگا کہ اس کے گھر میں سؤر کا گوشت کھایا جائے اور شراب پی جائے۔ لڑکی غیر مسلم ہوئی تو ہمارے محرمات کا خیال نہیں کرے گی اور گھر برباد ہو جائے گا۔ لڑکے کی سمجھ میں بات آگئی اور وہ کچھ متذبذب ہو گیا۔ انہیں دنوں اس کی اسلامک سنٹر کے مصری ڈائرکٹر سے ملاقات ہوئی۔ ان صاحب نے ڈاکٹر آر بری کے ساتھ مل کر ایک کتاب شائع کرائی ہے اور اب جامعہ ازہر کی کلیۂ شریعہ کے صدر ہو کر واپس مصر گئے ہیں۔ انہوں نے اس لڑکے سے کہا کہ اگر اس کی بیوی عیسائی رہنی ہے تو اسے کوئی حق نہیں کہ لڑکی کو شراب، سؤر وغیرہ سے روکے۔ جو چیز اس کے مذہب میں جائز ہے اسے کرنے کی اسلام نے اسے آزادی دی ہے مسلمان شوہر مداخلت کر کے گنہگار ہو گا۔

کیا یہ رائے درست ہے؟ کیا آنحضور صلعم کے معاہدۂ نجران سے یہ استنباط نہیں کیا جا سکتا کہ کسی مسلمان کی اہلِ کتاب بیوی کو اسلام کے متعین کردہ کبائر کی اجازت نہیں؟

(۴) یہی مصری صاحب بغیر مہر کے نکاح کے قائل تھے۔ کیا یہ درست ہے؟ کیا بغیر مہر کے نکاح جائز ہے؟

(۵) میرے بعض عراقی دوست جو کئی سالوں سے لندن میں مقیم ہیں اب تک نماز قصر کر کے پڑھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مسافرت کی حد نہ قرآن میں آئی ہے اور نہ حدیث

ہیں۔ فقہاء کی اپنی اختراع ہے۔ لہٰذا ہم نہیں مانتے۔ جب تک اپنے وطن سے باہر ہیں مسافر ہیں۔ قصر کریں گے، چاہے ساری عمر لندن میں گزر جائے۔ ان کو کس طرح مطمئن کروں کہ ان کی روش غلط ہے۔

(۶) یہی حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ روزہ کی قضا تو ہے لیکن نماز کی نہیں۔ بعد میں روزہ رکھنے کا حکم قرآن میں ہے۔ لیکن جو نماز ایک دفعہ کھو گئی وہ ہمیشہ کے لیے گئی۔ قرآن میں کہیں قضا نماز کا ذکر نہیں نہ ہی حدیث میں اس کے متعلق کچھ ہے۔ کیا یہ درست ہے؟

(۷) حصص کے سلسلہ میں ایک سوال اور ذہن میں آیا ہے۔ اب تک ڈسٹرن نے اور آپ نے بھی یہ کہا ہے کہ خریدنے کے بعد سال پورا ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ عام طور پر لوگ سال بھر تک ایک ہی حصہ نہیں رکھتے کبھی قیمت گرنے لگتی ہے تو بیچ دیتے ہیں۔ کبھی دوسرے حصص زیادہ نفع بخش نظر آنے لگتے ہیں تو اپنا بیچ کر دوسرے خرید لیے جاتے ہیں وغیرہ۔ ہمارے ہاں ممکن ہے کہ ابھی یہ بات عام نہ ہو لیکن یہاں یہی ہوتا ہے۔ کیا ایسی صورت میں بھی کسی ایک کمپنی کے حصہ پر سال پورا ہونے پر ہی زکوٰۃ عائد ہوگی؟ کیا اس طرح آدمی زکوٰۃ سے مستقلاً مستثنیٰ ہو جائے گا؟ زکوٰۃ ادا کرنے کی نیت کے باوجود زکوٰۃ کا موقع نہ آسکے گا؟

جواب - آپ کے سوالات کا مختصر جواب یہ ہے۔

(۱-۷) تجارتی حصص کی زکوٰۃ اس اصول پر نہیں نکالی جائیگی کہ گویا حصے کی رقم آپ کے پاس جمع ہے اور آپ جمع شدہ روپے کی زکوٰۃ نکال رہے ہیں۔ بلکہ ان کی زکوٰۃ تجارتی مال کی زکوٰۃ کے اصول پر نکالی جائے گی۔ اس کا قاعدہ یہ ہے کہ کاروبار شروع ہونے کی تاریخ پر جب ایک سال گزر جائے تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کے پاس تجارتی مال (STOCK IN TRADE)

کس قدر موجود ہے اور وہ کس مالیت کا ہے اور نقد روپیہ (CASH IN HAND) کتنا ہے۔ دونوں کے مجموعہ پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ نکالی جائیگی۔ اسی قاعدے پر دیکھا جائیگا کہ کمپنی یا کمپنیوں میں آپ کے جو حصے ہیں، اِس وقت بازاری قیمت کے لحاظ سے ان کی قیمت کیا ہے۔ سال کے دوران میں آدمی نے خواہ کتنی ہی مرتبہ پہلا حصہ فروخت کیا ہو اور دوسرا خریدا ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پہلا حصہ جب آپ نے خریدا اس وقت سے سال شمار کیا جائے گا اور سال کے خاتمہ پر آپ کے حصے کی جو بازاری قیمت ہو اس کے لحاظ سے زکوٰۃ کا تعین کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ آپ کے پاس نقد کس قدر موجود ہے۔ دونوں کے مجموعے پر ۲½ کی شرح سے زکوٰۃ نکالی جائے گی۔ رہی یہ بات کہ ٹیکس لگ کر آپ کی بقیہ آمدنی اتنی کم رہ جاتی ہے کہ زکوٰۃ دینے کی صورت میں وہ پوری کی پوری زکوٰۃ ہی میں چلی جاتی ہے، تو اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔ یہ تو ایسی حکومتوں کے ماتحت رہنے کی سزا ہے جو ٹیکس عائد کرتے وقت سرے سے زکوٰۃ کا کوئی لحاظ ہی نہیں کرتیں۔ یہ سزا ہمیں لازماً اس وقت تک بھگتنی ہو گی جب تک اس حکومت کا نظام ہم نہ بدل دیں جس میں ہم رہتے ہوں۔

(۲) قطبین کے قریب علاقوں کے اوقات عبادت کے معاملہ میں مجھے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے اجتہاد سے قطعاً اتفاق نہیں ہے۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ جن علاقوں میں رات اور دن کا الٹ پھیر ۲۴ گھنٹے کے اندر ہو جاتا ہے ان میں روزہ و نماز کے اوقات، اسی قاعدے پر ہونے چاہییں جو خطِ استوا سے قریب تر مقامات کے لیے ہے، خواہ رات دو ہی گھنٹے کی ہو یا دن دو ہی گھنٹے کا رہ جاتے۔ البتہ اس کے آگے جہاں رات اور دن ۲۴ گھنٹوں سے متجاوز ہو جاتے ہیں، وہاں گھڑیوں کے حساب سے اوقات مقرر کیے جانے چاہییں، اور ایسے مقامات پر تعینِ اوقات مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ کے معیار پر کیا جانا چاہیے۔

(۳) اہلِ کتاب کی جن عورتوں سے مسلمان کو نکاح کی اجازت دی گئی ہے ان کے بارے میں قرآن مجید دو شرطیں لگاتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ محصنات (پاک دامن) ہوں، دوسرے

یہ کہ ان سے نکاح کر کے ایک مسلمان خود اپنے ایمان کو خطرے میں نہ ڈال بیٹھے (ملاحظہ ہو سورۂ مائدہ آیت ۵)۔ ان شرائط کی رُو سے فاسق و فاجر کتابیات کے ساتھ شادی جائز نہیں ہے۔ اور یہ دیکھنا ایک مسلمان کا فرض ہے کہ جس عورت سے وہ شادی کر رہا ہے وہ اس کے گھر میں، اس کے خاندان میں، اور اس کے بچوں میں ایسے افعال رائج کرنے کی موجب نہ بنے جو اسلام میں حرام ہیں۔ بلاشبہ وہ اسے مذہب ترک کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اس کو چرچ جانے سے نہیں روک سکتا۔ مگر اسے شادی سے پہلے ہی یہ شرط کر لینی چاہیے کہ وہ اس کی زوجیت میں آنے کے بعد شراب، سور کے گوشت اور دوسری حرام چیزوں سے اجتناب کرے گی۔ ایسی شرط پہلے ہی طے کر لینے کا اسے حق بھی ہے اور ایسا کرنا اس کا فرض بھی ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دین کے معاملہ میں سخت تساہل کرنے والا آدمی ہے۔ اس کے بعد اگر اس کی اپنی اولاد ان حرام افعال میں مبتلا ہو (اور ظاہر ہے کہ اولاد کا ماں سے متاثر نہ ہونا متوقع نہیں ہو سکتا) تو اس کی ذمہ داری میں وہ بھی شریک ہو گا۔

(۴) نکاح بلا مہر ہو سکتا ہے، لیکن اسلامی فقہ کی رو سے اس طرح کے نکاح میں مہر مثل آپ سے آپ لازم آجاتا ہے۔

(۵) افسوس ہے کہ عرب ممالک کے نوجوان نہ تو خود دین کا کافی علم رکھتے ہیں اور نہ وہ فقہائے مجتہدین میں سے کسی کا اتباع ہی کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے آئے دن ان کے عجیب عجیب اجتہادات سننے میں آتے رہتے ہیں۔ مسافر کے معاملہ میں امام شافعی، امام احمد، اور ایک روایت کی رو سے امام مالک بھی، اس بات کے قائل ہیں کہ جو شخص کسی مقام پر چار دن یا اس سے زیادہ ٹھیرنے کا ارادہ رکھتا ہو اسے پوری نماز پڑھنی چاہیے۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ کا مسلک یہ ہے کہ دس دن یا اس سے زیادہ ٹھیرنے کی نیت مسافر کو مقیم بنا دیتی ہے۔ امام اوزاعی بارہ دن کی اور امام ابو حنیفہ پندرہ دن کی حد مقرر کرتے ہیں۔ علمائے اسلام میں سے کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ اپنے شہر سے باہر نکل کر کسی دوسرے مقام پر کوئی شخص چاہے مہینوں اور برسوں رہے

مگر وہ مسافر ہی رہے گا اور قصر کرتا رہے گا۔ البتہ فقہا یہ ضرور کہتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی کسی مقام پر اس طرح رُکا ہوا ہو کہ ہر وقت اس کے کوچ کر جانے کا امکان ہو، اور ٹھیرنے کی نیت نہ ہو، تو خواہ وہاں اسے مہینوں رکا رہ جانا پڑے، وہ قصر کر سکتا ہے۔ انہی وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک میں پندرہ دن اور فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں اٹھارہ دن قصر فرمایا (مسند احمد و ابو داؤد) اور انہی وجوہ سے صحابہ کرام کا لشکر آذربیجان کی مہم میں دو مہینے قصر کرتا رہا (مسند احمد)

(۶) یہ بات بھی سخت حیرت انگیز ہے کہ یہ لوگ نماز کی قضا کے قائل نہیں ہیں حالانکہ یہ چیز بکثرت احادیث سے ثابت ہے اور تمام فقہائے اسلام بالاتفاق اس کے قائل ہیں۔ پوری اسلامی تاریخ میں کوئی ایک قابلِ ذکر فقیہ بھی اس کا قائل نہیں ہوا ہے کہ روزے کی قضا تو واجب ہے مگر نماز کی قضا واجب نہیں۔ بخاری، مسلم، نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی اور مسند احمد میں متعدد احادیث حضرت انسؓ، ابوہریرہؓ اور ابو قتادہ انصاری سے مروی ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نماز کو انسان بھول جائے، یا سوتا رہ جائے اور نماز کا وقت نکل گیا ہو، تو جس وقت بھی اسے یاد آئے یا وہ بیدار ہو اسے وہ چھوٹی ہوئی نماز پڑھ لینی چاہیے۔ یہ تو ہے حضور کا قولی حکم۔ رہا آپ کا اپنا فعل، تو ابو سعید خدری، جابر بن عبداللہ اور عمران بن حصین سے متعدد واقعات مسند احمد، بخاری، مسلم اور نسائی میں منقول ہیں جن میں وہ بتاتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے چھوٹی ہوئی نمازیں ادا کی ہیں۔ ایک سفر میں رات بھر چل کر آخر وقت میں قافلے نے پڑاؤ کیا اور اُترتے ہی سب پر نیند غالب ہو گئی یہاں تک کہ جب سورج نکل آیا تو اس کی گرمی سے لوگ بیدار ہوئے۔ حضورؐ نے فوراً اذان دلوائی اور جماعت کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی۔ غزوۂ خندق میں ایک روز عصر کی نماز قضا ہوئی اور حضور نے مغرب کے وقت ادا کی۔ اور ایک اور دن اسی غزوہ میں ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں قضا ہوئیں اور ایسے وقت یہ تینوں نمازیں ادا کی گئیں جبکہ عشاء کا وقت شروع ہو رہا تھا۔ اس کے بعد یہ کہنے کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے کہ جو نماز چھوٹ گئی وہ معاف ہے؟

مطبوعات

نظام الملک طوسی تالیف ۔ مولانا عبدالرزاق کانپوری ۔ شائع کردہ نفیس اکیڈمی، بلاسس اسٹریٹ ۔ قیمت مجلد بارہ روپے صفحات ۵۶۰ ۔

عباسیوں کے وزراء آل برمک کے بعد سب سے زیادہ جس وزیر نے حسنِ تدبّر، فکر رسا اور خدمتِ دین میں غیر معمولی شہرت حاصل کی وہ نظام الملک طوسی تھا۔ یہ وزیر بیک وقت ایک صاحب طرز ادیب، اور ایک مخلص عالم تھا۔ اس کے عہد وزارت میں باطنی فرقہ کی سرگرمیاں بہت تیز ہو چکی تھیں۔ حسن بن صباح نے نہ صرف لوگوں کے دین و ایمان پر ڈاکے ڈالنے شروع کیے بلکہ سازشوں کا ایک وسیع جال پھیلا دیا اور اُس کے ساتھی ہر اُس شخص کو قتل کرنے کے درپے تھے جو ان کے راستے میں مزاحم ہو سکتا تھا۔ بیشمار قیمتی جانیں اس سفاک اور عیار گروہ کے ہاتھوں ضائع ہوئیں۔ خود نظام الملک کو بھی اس فرقہ کے ایک آدمی نے شہید کیا۔

زیر تبصرہ کتاب میں جہاں ایک طرف نظام الملک طوسی جیسے باکمال وزیر کی پوری زندگی مؤرخانہ دیانتداری سے قلمبند کی گئی ہے، وہاں حسن بن صباح اور اس کی خوفناک تحریک کا بھی بڑی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

نظام الملک کے حالات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نیک دل وزیر اس بات کا انتہائی آرزومند تھا کہ مملکت کا پورا نظام اسلامی شریعت کے مطابق چلایا جائے۔ سیاست نامہ میں اس کی جو تفصیلات ملتی ہیں وہ اس آرزو اور تمنا کی پوری طرح غمازی کرتی ہیں۔ وہ بادشاہ اور رعایا کے فرائض کے تحت لکھتا ہے:۔

"جب لوگ شریعت کی پابندی چھوڑ کر دین و مذہب کا خاکہ اڑانے لگتے ہیں

اور خدا کے احکام کی تعمیل نہیں کرتے ہیں اُس وقت وہ اُن کے اعمال کی سزا دینا چاہتا ہے اور بجائے عادل اور مہربان بادشاہ کے ظالم حکمراں مسلط کرتا ہے۔ اس دور میں انقلاب میں خون کی ندیاں بہ جاتی ہیں اور گنہگار اپنے کرتوتوں کی سزا پاتے ہیں۔ اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے کہ جب نیستان میں آگ لگتی ہے تو اول وہ خشک چیزوں کو جلاتی ہے پھر ہمسائیگی کے طفیل تر و تازہ چیزیں بھی جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔"

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر وہ فرمانرواؤں کو یہ نصیحت کرتا ہے:

"بادشاہوں کو خدا کی رضامندی حاصل کرنا چاہیے، مگر یہ رضامندی جبھی ہو سکتی ہے کہ بندگانِ خدا پر عدل و احسان کیا جائے۔ عدل کا ثمرہ بادشاہ کو یہ ملتا ہے کہ رعایا ٹھنڈے دل سے دعائیں مانگتی ہے، جس سے سلطنت مستحکم اور ملک میں اضافہ ہوتا ہے اور دین و دنیا کی نیک نامی حاصل ہوتی ہے اور آخرت کا حساب ہلکا ہو جاتا ہے چنانچہ مشہور قول ہے کہ الملک یبقی مع الکفر ولا یبقی مع الظلم یعنی سلطنت کفر سے تو باقی رہ جاتی ہے مگر ظلم و ستم سے نہیں رہتی۔"

"بادشاہ پر واجب ہے کہ فرض و سنت اور احکام شریعت کے قائم رکھنے کی کوشش کرے ...... حدیث میں آیا ہے کہ بادشاہ کے واسطے سب سے اچھی چیز اُس کا پاکیزہ مذہب ہے، کیونکہ مملکت اور مذہب مثل دو بھائیوں کے ہیں۔ جب مملکت میں انقلاب ہوگا تو مذہب میں بھی رخنہ پڑے گا اور جب مذہب میں فتور ہوگا تو سلطنت پر بھی اُس کا اثر پڑے گا۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سب سے اچھا بادشاہ وہ ہے جو اہلِ علم سے صحبت رکھتا ہو اور سب سے برا وہ عالم ہے کہ جو بادشاہ سے ملتا ہو۔"

پھر نظام الملک بادشاہ کو یہ چیز بھی ذہن نشین کراتا ہے کہ اُسے امورِ سلطنت میں عورتوں کو دخیل نہیں ہونے دینا چاہیے اور اس کی وجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ "بیگماتِ شاہی جو حکم دیتی ہیں یہ

ہمیشہ وہی ہوتے ہیں جو اہلِ غرض انہیں سمجھا دیتے ہیں کیونکہ مردوں کی طرح عورتوں کو برأی العین دیکھنے کا موقعہ نہیں ملتا بلکہ اُن کی پیش خدمتیں کان بھرتی رہتی ہیں اس لیے عورتوں کے احکام راستی کے خلاف ہوتے ہیں، جن سے فتنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "عورتوں کا کلام بھی مثل عورتوں کے پردے میں رہنا چاہیے یعنی جس طرح علانیہ کوئی اُن کو نہیں دیکھ سکتا ہے، اسی طرح کھلم کھلا کوئی اُن کی بات بھی نہیں سُن سکتا ہے۔

نظام الملک کے نصائح کا سب سے مؤثر حصہ وہ ہے جس میں اُس نے اپنے فرزند ارجمند کو خطاب کیا ہے۔ اس حصہ میں وہ اپنے دلبند کو اُن سارے خطرات سے آگاہ کرتا ہے جو مسند وزارت سنبھالنے کے بعد وزراء کو پیش آتے ہیں۔ یہ حصہ بڑا ہی مؤثر اور اُس کی دلی کیفیات کا ترجمان ہے۔ اس کے ہر لفظ سے اُس کا خلوص جھلکتا ہے۔ وہ اپنے لڑکے کو پہلی نصیحت یہ کرتا ہے:

"میرے بعد وزارت اختیار نہ کرنا اور جہاں تک ہو سکے دولتِ جاوید یعنی قناعت کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا اور دنیا کی چاپلوسی پر شیدا اور فریفتہ نہ ہو جانا کیونکہ اول کی لذتیں آخرت کی مسرتوں کی برابر قیمت نہیں رکھتی ہیں۔"

پھر اس کی وجہ یہ بتاتا ہے:

"صبح سے شام تک بلا ناغہ لوگوں کے معاملات میں وزیر کو مختلف احکام صادر کرنا پڑتے ہیں اور حکم الٰہی یوں ہے فاحکم بین الناس بالعدل یعنی جو حکم ہو وہ کانٹے کی تول ہو ایسی صورت میں خدانخواستہ اگر اُن میں سے کوئی ایک بھی حکم خداوندی کے خلاف صادر ہو جائے تو اس ایک لحظہ کے نقصان کی تلافی سو برس کی حکومت میں نہیں ہو سکتی ہے۔"

کتاب کا وہ حصہ بھی بڑا دلچسپ اور قابل قدر ہے جس میں فرقہ باطنیہ کا محققانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ اس فرقہ کے معتقدات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے رہنماؤں نے شرعی احکام

کو مٹانے کی کوشش نہ کی بلکہ اُن کی اس انداز سے تاویل کی کہ پورا دین بازیچۂ اطفال بن کر رہ گیا۔ اُن کے نزدیک قادرِ مطلق (معاذ اللہ) محض ایک عضو معطل تھا۔ وہ خدا کو قادر ان معنوں میں نہیں مانتے تھے کہ وہ کائنات کی ہر چیز پر قادر ہے بلکہ اس سے اُن کی مراد یہ تھی کہ اُس نے دوسروں کو قدرت عطا کی ہے۔ اسی طرح صلوٰۃ کے معنی امام کو یاد کرنا اور نماز با جماعت کے معنی امام معصوم کی متابعت کرنا تھا۔ روزہ کا مفہوم اُن کے نزدیک یہ تھا کہ انسان امام کے اسرار کی حفاظت کرے، یا اپنے مقتداء کے افعال کو خاموشی سے دیکھتا رہے اور اگر وہ فواحش میں مبتلا ہو تو اُس کو بھی افعالِ حسنہ سمجھے۔ طوافِ کعبہ سے مراد امام کے گھر کا طواف کرنا ہے۔

عمر خیام سے جو روایات عام طور پر منسوب کی جاتی ہیں ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ محض ایک شاعر رند مشرب تھا۔ فاضل مصنف نے بڑی تحقیق کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ وہ صرف شاعر نہ تھا بلکہ فلسفہ، منطق، ریاضی، تفسیر، علمِ قرأت اور علم نجوم کا بھی ایک بردست عالم تھا۔

یہ پوری کتاب معلومات کا ایک خزینہ ہے۔ اس کے مطالعے سے اسلامی تاریخ کا ایک روشن اور تابناک دور سامنے آجاتا ہے اور اُن لوگوں کی غلطی واضح ہو جاتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اسلامی نظام صرف ۲۳ برس تک دنیا میں قائم رہا اور اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے درہم برہم ہو گیا۔

کتاب کا معیارِ طباعت عمدہ ہے البتہ کتابت کی غلطیاں ذوق پر گراں گزرتی ہیں۔

جیتا جاگتا تالیف: علامہ ابن طفیل۔ اردو ترجمہ مع تبصرہ۔ ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب ایم، اے، پی، ایچ۔ ڈی۔ صدر شعبۂ عربی کراچی یونیورسٹی۔

زیر تبصرہ کتاب ابن طفیل کی شہرہ آفاق تصنیف "حی بن یقظان" کا شُستہ اور رواں ترجمہ ہے۔ اس فاضلانہ تصنیف میں ایک عام فہم اور دلچسپ قصے کے ذریعہ یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان فطری طور پر موحد ہوتا ہے اور اگر خارجی حالات

اور ماحول اُس کے خیالات اور احساسات کو غلط راہ پر نہ ڈالیں تو وہ تلاشِ حق میں خود بخود کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس قصہ میں ایک ایسے انسان کی داستانِ حیات قلمبند کی گئی ہے جس نے انسانوں کی صحبت سے بہت دُور جنگلوں میں نشوونما پائی، اُس نے اپنی فطری اور جبلّی صلاحیتوں کی مدد سے مادّی زندگی کی ضروریات فراہم کیں اور اپنے شعور اور وجدان سے ایک قادرِ مطلق ذات کا ادراک کیا۔ فاضل مصنّف نے اس قصّے کے واقعات بیان کرتے ہوئے نہایت ہی حکیمانہ انداز میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ جس طرح انسان کی فطرت میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات میں تصرف حاصل کرے اسی طرح اُسے قدرت نے ذاتِ حق کا بھی فطری طور پر شعور و احساس بخشا ہے اور اگر اُسے اُس کی فطرت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ یقیناً حق کو پانے میں کامیاب ہو گا۔ تلاشِ حق میں حی بن یقظان کو مختلف منازل سے گزرنا پڑا۔ پہلی منزل میں اُس کے دل میں یہ احساس پیدا ہو کہ یہ سارا کارخانہ قدرت یونہی بغیر کسی کارساز کی تدبیر اور حکمت کے تو پیدا نہیں ہو گیا، دوسری منزل میں وہ اپنی ذات اور ذاتِ حق کے بارے میں مختلف نظریات قائم کرتا ہے اور پھر ریاضت کرتے کرتے مشاہدۂ حق سے بہرہ ور ہو جاتا ہے۔ اس وقت اُس کی ابسال سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ اسے شرع کی تفصیلات بتاتا ہے حی بن یقظان کو یہ معلوم کر کے حیرت بھی ہوتی ہے اور مسرت بھی کہ شرع میں اپنی عقل سے پیدا کیے ہوئے نتائج اور ذاتِ حق کے مشاہدات میں کوئی تناقض نہیں پایا جاتا۔

فاضل مصنف نے اس قصہ میں جن اہم نکات کی نقاب کشائی کی ہے وہ بالکل صحیح اور درست ہیں۔ انسان واقعی اپنے وجدان اور شعور سے خالقِ کائنات کے وجود کا ادراک تو کر سکتا ہے مگر اُس کی صفات اس کے احکام اور اُن کے مضمرات کو مجرد اپنی عقل سے نہیں سمجھ سکتا اس لیے اُسے ایسے نفوسِ قدسی کی قدم قدم پر رہنمائی کی ضرورت در پیش ہے جن سے خداوند تعالیٰ ہم کلام ہو کر انہیں اپنا منشا واضح کرتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی رہنمائی کے بغیر حق کو اُس کی ساری تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ ساتھ ٹھیک ٹھیک جاننا بالکل ناممکن ہے۔

فاضل مترجم نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے اور آغاز میں ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے جس میں عقل، نقل اور کشف کے حدود کی نشاندہی کی ہے۔ اس مقدمہ کے ایک حصے کے متعلق ہم یہ گذارش پیش کرتے ہیں کہ انسانیت کو فکری اعتبار سے مختلف ادوار میں تقسیم کرنا ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ ہمارے نزدیک اس تقسیم سے بہت سی الجھنیں پیش آتی ہیں جن کو کسی طرح سلجھایا نہیں جا سکتا ہے۔ پھر فاضل مصنف نے سابق انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی تعلیمات میں عقل کی اہمیت کو جس انداز سے گھٹایا ہے وہ بھی محل نظر ہے۔

اس مقدمہ میں جو دوسری چیز کھٹکتی ہے وہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس نام کے ساتھ غیر ضروری اختصار ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جہاں کہیں حضورؐ کا نام درج کیا ہے وہاں صرف محمد (صلعم) لکھا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں۔ امت کے ائمہ اور صلحا نے اس اختصار کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ چنانچہ امام نووی رحمۃ اللہ نے یہ کہا ہے حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں آن کے اسم مبارک کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم تحریر کرنا چاہیے اور اس میں اختصار سے کام نہ لینا چاہیے۔ یہ بات اگرچہ امام موصوف نے کتابتِ حدیث کے تحت کہی ہے لیکن اس کا حکم عام ہے اور صلحائے امت نے اس کا اہتمام کیا ہے۔

ان دو گذارشات کے علاوہ باقی کتاب بڑی قابلِ قدر ہے اور مترجم کی محنت اور قابلیت کی پوری طرح آئینہ دار۔

متصوفانہ نظریات کی تشکیل جدید (انگریزی) تالیف جناب ملک محمد اشرف صاحب شائع کردہ: دی وائی ڈبلیو پبلیکیشنز، گجرات مغربی پاکستان۔ قیمت آٹھ روپیہ صفحات ۲۳۰۔

کتاب کے مصنف ایک دردِ دل رکھنے والے مسلمان اور صاحبِ علم بزرگ ہیں۔ انہوں نے چند سال پیشتر علامہ اقبال مرحوم کی کتاب ارمغانِ حجاز کے ایک حصے (شیطان کی مجلس شوریٰ

کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا تھا جو علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ یہ کتاب بھی ان کے سوز اور جذبۂ ایمانی کی ترجمان ہے۔ اس مختصر بحث میں انھوں نے اسلامی تصوف کے اندر غیر اسلامی رجحانات کی نشان دہی کی ہے اور آخر میں بتایا ہے کہ وہ طریقت جو شریعت سے آزاد ہو وہ سراسر گمراہی اور ضلالت ہے۔

پس طریقت چیست اے والا صفات
شرع را دیدن بہ اعماق حیات

الحکمۃ فی مخلوقات اللہ تالیف۔ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ۔ ترجمہ:۔ مولنا محمد علی لطفی۔ تعارف جناب مفتی محمد شفیع صاحب۔ ملنے کا پتہ ۲۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۵۔ صفحات ۱۴۴۔

قرآن مجید نے ذات باری تعالیٰ کا صحیح احساس اور شعور پیدا کرنے کے لئے انفس و آفاق پر بار بار غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ ایک انسان جب اپنی جسمانی ساخت کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نہایت ہی پیچیدہ مشین بڑی حکمت اور دانائی کے ساتھ تیار کی گئی ہے اور وہ بڑی عمدگی کے ساتھ اپنا کام کر رہی ہے۔ انسان کی دلی کیفیات اور قلبی واردات اس بات کی نہایت واضح طور پر غمازی کرتی ہیں کہ اس عالم مجاز و محسوسات سے بالاتر، ہمارے نظام کائنات سے ارفع و اعلیٰ ایک ان دیکھا نظام موجود ہے جس کی منشا کے ساتھ خود کو مطابق کرنا، انسان کی فطری آرزو اور امنگ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ خود اس

دیکھے بھالے بن سوجھے جانے پہچانے بن بوجھے

وجود کا احساس انسان کے نفس میں کیونکر پیدا ہوتا ہے۔ کبھی تو یہ احساس صحفِ سماوی کی سند پر ایمان رکھنے کی وجہ سے پرورش پاتا ہے۔ کبھی دنیا کے ہنگامۂ خیر و شر کو دیکھ کر یہ احساس ابھرتا ہے کہ ایک اعلیٰ اور بالا مقتدر ضرور ہونا چاہیے۔ کبھی فطرت کے حسین مناظر

کو دیکھ کر انسان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔ انسان نے ہمیشہ سے فطرت کے جمال میں حسنِ ازل کی جھلک دیکھی ہے۔ پہاڑوں اور جنگلوں کی خاموشی گویائی پکار پکار کر اسے ایک وجود کی طرف متوجہ کرتی رہی ہے۔ سورج کی خشمگیں کرنوں میں، چاند کی ٹھنڈک میں، صبح کی صباحت اور شام کی ملاحت میں اُسے آیاتِ الٰہی نظر آتی ہیں۔ دنیا کا کوئی ادب نہیں جس میں ہمیں ان آیاتِ وجدانی کے متعلق انمول جواہر پارے نہیں ملتے۔ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے انہی آیاتِ وجدانی کی حکمتوں پر اپنے حکیمانہ اسلوب میں بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ؎

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار

ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

مولانا محمد علی لطفی صاحب نے اس بیش قیمت کتاب کا اردو میں ترجمہ کر کے ایک قابلِ قدر خدمت سرانجام دی ہے۔

تاریخ صُحُفِ سماوی | تالیف: پروفیسر سید نواب علی صاحب۔ شائع کردہ: مکتبہ افکار ایبین روڈ کراچی۔ قیمت مجلد پانچ روپے۔ صفحات ۳۶۸

یہ فاضلانہ کتاب سب سے پہلے ۱۹۱۹ء میں نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی اور اس نے ملک کے سارے علمی حلقوں سے غیر معمولی خراجِ تحسین حاصل کیا۔ اب اکتالیس برس کے بعد اس قیمتی تصنیف کو فاضل مصنّف نے نظرِ ثانی اور مفید اضافوں کے ساتھ دوبارہ شائع کیا ہے۔ پوری کتاب پروفیسر صاحب کے تبحرِ علمی، اور ذوقِ تحقیق کی آئینہ دار ہے۔ اس میں انہوں نے عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کی صحت پر بڑی عمدگی سے بحث کی ہے اور مستند حوالوں کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ ان کے ماننے والوں نے ان میں بہت کچھ ردوبدل کیا۔ تیسرے حصّے میں انہوں نے بڑے ہی ٹھوس دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید ہر قسم کی تحریف سے محفوظ ہے اور اس کا جو نسخہ ہمارے پاس موجود ہے یہ بالکل وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضور سرورِ کائنات پر نازل کیا تھا۔ اس میں کسی ایک لفظ یا شوشہ تک کا تغیر و تبدل نہیں ہوا۔

ہمارے نزدیک یہ ایک نہایت ہی عمدہ اور مستند کتاب ہے۔ اس کے مطالعہ کی ہم پُرزور سفارش کرتے ہیں۔

سیرت عثمانؓ تالیف: مولانا خالد گرجاکھی۔ شائع کردہ: مکتبۂ نور۔ گرجاکھ۔ ضلع گوجرانوالہ۔

مولانا خالد صاحب نے یہ کتاب لکھ کر وقت کی ایک اہم ضرورت کو پُورا کیا ہے۔ اُردو میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو کافی معلومات مل جاتی ہیں لیکن خلیفۂ راشد حضرت عثمان ذوالنورین کی حیاتِ طیّبہ کے بہت سے گوشے اردو داں طبقہ کی آنکھوں سے ابھی تک مستور تھے۔ مولانا خالد صاحب نے ان سے نقاب کشائی کی ہے۔

تفہیم القرآن جلد سوم

سورۃ الکہف تا سورۃ الرّوم

تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ امید ہے کہ اگست ۱۹۶۲ء میں فرمائشوں کی تعمیل اُسی ترتیب سے شروع ہوگی جس ترتیب سے ہمارے ہاں فرمائشیں درج ہیں۔ اگر آپ نے ابھی تک اپنی فرمائش نہیں بھیجی تو آج ہی فرمائش درج کرا دیں ورنہ ممکن ہے کہ آپ کو دوسرے ایڈیشن تک انتظار کرنا پڑے۔

جن حضرات کی فرمائشیں ہمارے ہاں پہلے سے درج ہیں وہ آخر جولائی میں تجدید فرمائش کے ہمراہ -/5 روپے پیشگی بذریعہ منی آرڈر ارسال فرماویں بقیہ کا وی۔پی کر دیا جائے گا۔

جلد سوم کی ضخامت پہلی دونوں جلدوں سے زیادہ ہے۔ اس میں جغرافیائی نقشہ جات کے علاوہ ارض القرآن کی متعدد عکسی تصاویر بھی شامل ہیں۔ ہدیہ کا اعلان عنقریب کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ:

جلد اوّل سورۂ فاتحہ سے سورۃ الانعام قسم عام ۱۶/۲۵ قسم اوّل ۲۱/۲۵

جلد دوم سورہ الاعراف سے سورۃ بنی اسرائیل ۱۸/۲۵ قسم اوّل ۲۲/۷۵

سٹاک میں موجود ہیں۔ فرمائش اس پتہ پر تحریر فرمادیں۔ مکتبہ تعمیر انسانیت موچی دروازہ لاہور